بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۶ء مطابق ۲۸/ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ | شمارہ نمبر ۲۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول
شمس الحق ندوی

نائب مدیر
محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر
محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی
محمد نفیس خان ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت
مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

اس شمارے میں

نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۴
مہتمم صاحب دارالعلوم کا حادثۂ وفات	شمس الحق ندوی	۵
ندوہ اپنے سرپرست سے محروم	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۶
موت کے بعد جاری رہنے والی نیکیاں	مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی	۱۳
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۴
اسلام کے علاوہ کوئی راہِ نجات نہیں	حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	۱۵
چین میں اسلام اور مسلمان	مولانا سید عنایت اللہ ندوی	۱۷
اخلاق و اعمال کا فساد اور اس کے نتائج	مولانا محمد عثمان خان ندوی	۱۹
حالات کی گردش اور تجدید عزم	مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی	۲۱
نوجوان: ملت کا اہم ترین سرمایہ	مولانا محمد زین الحق ندوی	۲۳
ذرائع ابلاغ میں بیانیہ کی اہمیت....	مولانا منور سلطان ندوی	۲۶
ایک عہد علم و ادب کا اختتام	محمد جاوید اختر ندوی	۲۹
تعارف و تبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۱
مولانا اعظمیؒ کی شخصیت کے چند نمایاں نقوش	محمد نفیس خان ندوی	۳۲

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہو جانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یوروپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ 100$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہو چکا ہے، لہذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

نعت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نتیجۂ فکر: مولانا محمد سمعان خلیفہ بھٹکلی ندوی

کیوں دلِ ناصبور اتنا رنجور ہے
نیند کیوں اس قدر آنکھ سے دور ہے

کس کے جلووں کی خاطر یہ مضطر ہوا
کس کی فرقت میں دل درد سے چور ہے

مضطرب کس کی خاطر رہیں دھڑکنیں
کس کی یادوں سے دل میرا معمور ہے

آنکھ بے تاب ہے اور سینہ فِگار
ان کی بس اک جھلک حاصلِ طور ہے

جب سے امت نے چھوڑا ہے نقشِ نبی
نرغۂ دشمناں میں وہ محصور ہے

روضۂ مصطفی رشکِ خلدِ بریں
اس کا دیدار تسکینِ مہجور ہے

ان کے ہاتھوں ملے جامِ کوثر مجھے
وعدۂ وصل پر عشق مسرور ہے

جب سے سمعانؔ نے نعت ان کی لکھی
اس کی دنیائے افکار میں نور ہے

راستہ پُر خطر اور سفر دور کا
خوف سے دل دہلتا ہے مجبور کا
سازوسامان آنسو ہیں مہجور کا
چارہ گر کون ہے قلب رنجور کا
غم کے ماروں کا ہے ارمغانِ سلام

موجِ طوفاں میں ہے کشتیِ زندگی
دل پہ چھایا ہے احساسِ شرمندگی
کھو چکے ہیں سبھی لفظ تابندگی
کیسے آئے خیالوں میں رخشندگی
دل کے پاروں کا ہے ارمغانِ سلام

پیش کردوں میں دل ہو اجازت تری
دل ہے ٹوٹا ہوا اور محبت تری
یہ محبت بھی ہے اک عنایت تری
جان ہے آرزو کی شفاعت تری
جاں نثاروں کا ہے ارمغانِ سلام

ہے سخنؔ بے قرار اور زباں بے نوا
مجھ کو رسوا نہ کر مصطفیٰ کے خدا
دامنِ عفو ہے بس مرا آسرا
ہو نگاہِ کرم اے مرے ساقیا
بے سہاروں کا ہے ارمغانِ سلام

اداریہ

مہتمم صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کا حادثۂ وفات

شمس الحق ندوی

نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ۷/اکتوبر بروز بدھ طویل علالت کے بعد مہتمم صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کا انتقال ہو گیا، جو دار العلوم کا بہت بڑا خسارۂ علمی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ایک علمی ودینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جواں سالی سے ہی ندوہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ حضرت مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وتربیت میں ایک طویل عرصہ رہے، جس کا ذکر انھوں نے اپنی معروف تالیف ''اڑتالیس سال شفقتوں کے سائے میں'' کے ذریعہ کیا۔ وہ ندوہ کی فکر ومنہج اور اسلوب کی ایک قابلِ قدر مثال تھے۔

مہتمم صاحب نے تقریباً ستر سال دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درس وتدریس میں گذارے اور ۲۵/سال سے زائد عرصہ اہتمام کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے ایک طرف اپنی تدریسی شان سے بھی اور نصاب سازی کے ذریعہ بھی دار العلوم میں معیارِ تعلیم کو ترقی اور بلندی دینے میں اہم کردار ادا کیا، اور دوسری طرف ہزاروں تشنگانِ علم وادب کی آبیاری کی، اور افراد سازی میں حصہ لیا۔

مولانا عرصۂ دراز تک دار العلوم ندوۃ العلماء کا منصبِ اہتمام بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کے اہتمام سے دار العلوم کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ وہ اپنی بہت سی خوبیوں اور کمالات کے ساتھ ندوہ سے نکلنے والے عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے مولانا سید محمد الحسنیؒ کے ساتھ روزِ اول سے ایڈیٹر رہے، اور محمد میاں کے انتقال کے بعد بھی رسالہ پابندی سے نکالتے رہے، جو ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ندوہ ہی سے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مرحوم کی ادارت میں نکلنے والے پندرہ روزہ ''الرائد'' میں بھی مولانا برابر 'کلمۃ الرائد' لکھتے رہے۔ ''تعمیرِ حیات'' سے بھی ابتدائی دور سے ہی محمد میاں مرحوم کے ساتھ منسلک رہے، اور یہ مجلہ جو اردو زبان میں ندوۃ العلماء کا ترجمان رہا ہے، اس کو اس کے معیار ومنہج کے مطابق ایک طویل عرصہ تک انھی دونوں حضرات نے نکالا، اور یہ اب بھی اللہ کا شکر ہے ان کے عملی نمونہ کو باقی رکھے ہوئے ہے، جس سے قارئین کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مہتمم صاحب مرحوم کی زندگی دوسرے کاموں میں بھی نہایت پابندی اور مثالی زندگی کا نمونہ رہی ہے۔ تعلیم وتدریس میں مولانا نے اپنے شاگردوں پر اچھا اثر چھوڑا۔ مولانا اپنے تمام ہی کاموں میں مستعدی کا قابلِ تقلید نمونہ رکھتے تھے، جس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے، اور عملی زندگی کا ایسا اچھا نمونہ پیش کرتے تھے کہ دیکھنے والوں میں خود عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کی کن کن خوبیوں کو بیان کیا جائے، اس کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ ''تعمیرِ حیات'' ان کی حیات وخدمات کے ذکر وبیان کے لیے اپنا ایک شمارہ خاص کرنے جا رہا ہے، ان شاء اللہ آپ اس میں بہت کچھ مہتمم صاحب کے بارہ میں پڑھیں گے، اور فائدہ اٹھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل سے نوازے، اور دین وعلم کے لیے ان کی خدمات کا بہترین صلہ ان کو عطا فرمائے۔

اللّٰهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وأكرم نزله ووسع مدخله، وغسله بالماء والثلج والبرد، ونقّه من الذنوب والخطايا كما ينقّى الثوب الأبيض من الدنس۔

☆☆

یادوں کے چراغ

ندوہ اپنے سرپرست سے محروم

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

[حضرت ناظم ندوۃ العلماء مدظلہ کی تقریر جو مؤرخہ ۸/ اکتوبر ۲۰۲۶ء مطابق ۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ جمعرات کو جامع مسجد ندوۃ العلماء میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے تعزیتی نشست کے موقع پر کی گئی، حضرت والا کی نظر ثانی کے بعد قارئین کے لئے پیش کی جارہی ہے]

الحمد رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا ونبينا ومولانا محمد وعلىٰ آلهٖ وصحبهٖ أجمعين وعلىٰ من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلىٰ يوم الدين أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحيم: {مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً} صدق الله العظيم، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: "اذكروا محاسن موتاكم" أو كما قال عليه الصلوٰة والسلام۔

حضرات اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی وفات بلاشبہ ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک بڑا حادثہ ہے، اگر ندوۃ العلماء کی پوری تاریخ دیکھی جائے اور معماران ندوۃ العلماء کی ایک فہرست تیار کی جائے تو انگلیوں پر جن چند افراد کو گنا جاسکتا ہے ان میں مولانا کی ذات اور ان کا اسم گرامی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ وہ چند لوگ جنھوں نے ندوہ کے لیے اپنی پوری زندگیاں کھپادیں اور تقریباً ۷۰-۷۵/ سال کی زندگی وقف کردی، ان میں دو شخصیتیں بڑی نمایاں ہیں، ایک شخصیت مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ہے، اگر ان کی طالب علمی کا زمانہ بھی جوڑ لیا جائے تو انھوں نے تقریباً ۸۵/ سال ندوہ میں گذارے، اسی طرح حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندویؒ جو ۱۹۵۲ء میں ندوہ تشریف لائے اور اس کے بعد ندوہ ہی کے ہوکر رہ گئے، اگر یہ مدت بھی دیکھی جائے تو تقریباً ۷۶/ سال کا زمانہ ہے جو تدریس اور ندوہ کی دوسری اہم ذمہ داریوں کے سنبھالنے میں گذرا۔

اداروں کی تاریخ میں یہ ایک نایاب بات ہے کہ اتنی طویل مدت لوگوں نے کھپائی ہو اور انھوں نے اداروں کو ترقی دینے میں اپنی ساری صلاحیتیں لگادی ہوں، الحمد للہ ہمارے حضرت مہتمم صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا، وہ اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں بیمار رہے، ہوسکتا ہے کہ اس وقت ندوہ کے بعض جدید طلبہ کو ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل نہ ہوا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اخیر تک دار العلوم سے پوری طرح وابستہ رہے اور اپنے تمام تر اعذار اور کمزوریوں کے باوجود ندوہ کی خدمت میں مصروف رہے اور فکر مند رہے، سچی بات یہ ہے کہ ایسی فکر کرنے والے خال خال ہوتے ہیں، ان کو دار العلوم سے ایسا تعلق تھا کہ گویا اس کے ایک ایک ذرہ ذرہ سے لگاؤ تھا، ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ کس طرح اس کی ترقی ہو، وہ کسی بھی قیمت پر ندوہ کی کوئی چیز ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے، ان کی پوری زندگی ندوۃ العلماء کی خدمت میں گذری۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ان کا شروع سے بڑا گہرا تعلق تھا، مولانا نے ان کو ابتدائی دور میں بعض کتابیں بھی پڑھائی تھیں پھر یہ تعلق اخیر تک قائم رہا، زمانہ طالب علمی ہی میں مولانا کی ذہانت اور علمی استعداد کو دیکھ کر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا، ہمارے پاس وہ خط محفوظ ہے، حضرت مولاناؒ نے مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ کو کہیں باہر سے یہ خط لکھا کہ ایک بہت ذی استعداد طالب علم ہے، آپ ان کو روک لیجیے، ہم ندوہ پہنچ کر ان کا نظام بنائیں گے، پھر اس کے بعد مولانا ندوہ سے اس طرح وابستہ ہوگئے کہ وفات تک وہ سلسلہ باقی رہا، جب کہ مولانا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، ان کے سامنے بڑی بڑی پیشکشیں تھیں، اس لیے کہ اللہ نے ان کو عربی زبان کی قوی استعداد عطا فرمائی تھی، زور خطابت، تحریر کا ملکہ اور فکر کی بلندی ایسی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو کسی بڑے ادارہ میں چلے جاتے اور وہاں ان کو ہر طرح کی دنیاوی سہولتیں حاصل ہوجاتیں لیکن وہ یہاں قربانیاں دے کر رہے اور حق وفا ادا کیا، ارشاد ربانی ہے:

{فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ} (تو بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کردیا اور بعض انتظار میں ہیں۔)

سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کردیا، انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی کسی دوسری چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، اگر ان کی پوری زندگی دیکھی جائے تو ان کو ندوۃ العلماء سے ایک لمحہ کے لیے الگ نہیں کیا جاسکتا، حضرت مولاناؒ نے بالکل شروع میں انھیں اپنے استاذ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشیؒ کے پاس بھیجا، وہ حضرت مولاناؒ کی طالب علمی کے دور میں ندوہ میں تدریس کے فرائض انجام دے چکے تھے، مولانا مسعود عالم ندویؒ اور اس دور کے بڑے ندوی فضلاء ان کے شاگرد ہیں، ان کے ذریعہ ندوہ کے طلبہ کو عربی زبان وادب میں بڑی مہارت حاصل ہوئی، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے حضرت مہتمم صاحب کو ان ہی کی خدمت میں مراکش بھیجا، انھوں نے وہاں اچھا وقت گذارا اور خوب استفادہ کیا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کو زبان وادب کی باریکیاں حاصل ہوئیں۔

اللہ نے مولانا کو تدریس کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، تمام تر ذمہ داریوں کے باوجود ان کی پوری زندگی تدریس میں گذری، جن لوگوں نے مولانا سے انشاء پڑھی ہے اور الحمد للہ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے بھی مولانا کو انشاء دکھائی ہے، سچی بات یہ ہے کہ وہ ایسی باریکیوں پر نگاہ رکھتے تھے کہ عام طور پر ان کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی۔ وہ یہاں اصلاً مدرس رہے لیکن دیگر ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد کی گئیں، جب مولانا محب اللہ صاحبؒ کمزور ہوگئے تو انتظامیہ کا فیصلہ ہوا کہ ان کو مشرف اداری بنا دیا جائے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے پوری مستعدی کے ساتھ نظام کو سنبھالا اور نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششیں کیں، اس کے بعد وہ کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید ہوئے، اس کے بعد جب حضرت مولانا رابع صاحب کو ناظم بنایا گیا تو مولانا کو باقاعدہ منصب اہتمام تفویض کیا گیا اور تقریباً ۲۷ سال مولانا اس منصب پر فائز رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو شروع سے انتظامی صلاحیت دی تھی اور ایک خاص رعب عطا فرمایا تھا، حضرت مولانا عمران خاں صاحبؒ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اللہ نے ان کو بڑی انتظامی صلاحیت دی تھی، حضرت سید صاحبؒ ان کو ندوہ لے کر آئے اور انھیں منصب اہتمام سپرد کیا گیا، انھوں نے ندوہ کو ترقی دی اور ان کی ذات سے ندوہ کو فائدہ پہنچا۔ اس کے بعد جو انتظامی صلاحیت اور جو رعب داب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے حضرت مہتمم صاحب کو عطا فرمایا تھا' وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

اداروں کو ایسی شخصیات بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہیں، یقیناً یہ ایک ایسا حادثہ ہے جو ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا خلا ہے، آج ندوۃ العلماء اپنے ایک سرپرست سے محروم ہوگیا، وہ ہمارے سرپرست تھے اور ہمارے والد صاحب علیہ الرحمہ کے قریبی دوستوں میں بھی تھے، حضرت شاہ حلیم عطا صاحبؒ جو یہاں شیخ الحدیث تھے' ان کے درس میں ہمارے والد صاحب، حضرت مہتمم صاحب اور مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی سب ایک ساتھ تھے۔ الحمد للہ اس وقت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوہ کے معتمد تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر میں برکت دے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب "البعث الاسلامی" کا اجراء ہوا، اس وقت ہندوستان میں کسی عربی مجلہ کا شائع کرنا آسان کام نہیں تھا، لیکن ان حضرات کی مستعدی اور اللہ کی طرف سے خاص توفیق کی بات ہے کہ ہمارے والد صاحب نے یہ مجلہ جاری کیا، اس وقت مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ ندوہ کے ناظم تھے، سرپرست کی حیثیت سے ان کا نام آرگن پر لکھا گیا اور اسی وقت سے حضرت مہتمم صاحب اس مجلہ کی ادارت میں شریک ہوئے اور آج ایک طویل مدت گذر چکی، اس میگزین کو جاری ہوئے ۷۰ سال سے زائد عرصہ گذر چکا لیکن اخیر تک الحمد للہ مولانا کے اشہب قلم سے اداریئے آتے رہے اور ساری دنیا اس سے فیض یاب ہوتی رہی۔

بلاشبہ یہ ان حضرات کے فکر کی بلندی تھی کہ اس وقت ان حضرات نے کیسے بلند اقدامات کیے، رابطہ عالم اسلامی کی تنظیم جس کا مکہ مکرمہ میں پورا ایک نظام قائم ہے اور اس کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، اس سے پہلے ان حضرات نے "مسلم ورلڈ لیگ" کے نام سے ایک رابطہ قائم کیا تھا اور پورے عالم اسلام کے علماء کو جوڑنے کی ایک تحریک چلائی تھی اور اس کے لیے عربی، اردو اور انگریزی میں باقاعدہ ایک Bulletin بھی جاری کیا تھا، ۲۰-۲۲ سال کی جو عمر ہوتی ہے جس کو عام طور سے لوگ ہوٹلوں میں گذار دیتے ہیں یا تفریحات میں صرف کرتے ہیں لیکن ان حضرات کی شروع سے تفریح یہی تھی کہ امت کے لیے تڑپتے تھے، ان کے اندر امت کی فکر تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہاں سے لے کر عالم عربی تک ان کی تحریروں کو صرف پڑھا ہی نہیں گیا بلکہ اس کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

جمال عبد الناصر کے زمانہ میں عالم عربی کے اندر جب قومیت عربیہ کا ایک فتنہ کھڑا ہوا جس کی سرپرستی عیسائی دنیا نے بھی کی، مسلمانوں کو بانٹنے اور قومیتوں میں تقسیم کرنے کی وہ پوری ایک سازش تھی، اس وقت ان حضرات نے "البعث الاسلامی" کے اندر ایسے غیر معمولی مضامین لکھے

اور اس طاقت کے ساتھ لکھے کہ وہاں تک اس کی گونج پہنچی، حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ سے بعض بڑے عرب علماء نے اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ آپ کے جواں سال ندوی فضلاء نے تو قومیت عربیہ کو ننگا کر دیا بلکہ اس بات کو مصر کی حکومت نے بھی محسوس کیا اور یہاں کی حکومت میں باقاعدہ اس کا احتجاج درج کرایا، پھر کچھ عرصہ ایسا بھی گذرا کہ ان حضرات کو روپوش ہونا پڑا اور ان کے پاس پورٹ بھی ضبط ہوئے، لیکن الحمد للہ اس کے باوجود وہ جو کلمہ حق کہتے تھے اس کو کہتے رہے۔

ان حضرات نے ندوہ کو غیر معمولی ترقی دی، واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کی جو نشاۃ ثانیہ ہے اور اللہ نے اس کو پورے عالم اسلام میں جو مقام دیا، اس میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا جو کردار ہے، اس پورے دور میں یہ تمام حضرات حقیقت میں حضرت مولانا کے دست وبازو تھے، اگر یہ حضرات نہ ہوتے تو یہ کام آسان نہیں تھا، حضرت مولانا رابع صاحبؒ، مولانا معین اللہ صاحبؒ، مولانا عبد اللہ عباس صاحبؒ، مولانا محمد الحسنی صاحبؒ، مولانا واضح رشید صاحبؒ اور حضرت مولانا سعید الرحمن صاحبؒ، مولانا اسحاق جلیس صاحبؒ، مولانا تقی الدین صاحبؒ یہ وہ اساطین ہیں جن سے ندوۃ العلماء کو فائدہ پہنچا، فکری اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اخیر دور میں ندوۃ العلماء نے اپنا جو مقام بنایا اور عالم اسلام میں اس کی جو ایک دھوم مچی، اس میں یقیناً ان تمام افراد کا بڑا حصہ ہے۔

اللہ نے ان کو جو قوتِ خطابت عطا فرمائی تھی اور عربی دانی کا جو ذوق دیا تھا' اس کو پوری عرب دنیا تسلیم کرتی تھی، زیادہ تر وہی ندوۃ العلماء کی نمائندگی کرتے تھے، وہی جاتے تھے اور جو عرب علماء یہاں آتے تھے تو ان کے سامنے وہی ندوہ کی ترجمانی فرماتے تھے، پھر ندوہ کے اسی منبر پر ان کا پچاس سال سے زیادہ زمانہ ایسا گذرا کہ انھوں نے اپنے خطاباتِ جمعہ کے ذریعہ پورا ایک پیغام دیا، الحمد للہ وہ خطابات شائع بھی ہوئے اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مولانا کی زندگی مثالی ہے، یقیناً ہم اساتذہ و طلبہ کے لیے اس میں نمونہ ہے، انھوں نے جس طرح اوقات کی پابندی کی، شاید کوئی دوسرا اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا، نمازوں کا اہتمام، امامت کا التزام اور درجات کی پابندی آخری درجہ کی تھی، یہ ممکن تھا کہ اگر آدمی اپنی گھڑی دیکھے تو اس کو لگے کہ آج مولانا دیر سے آئے ہیں لیکن اگر تحقیق کی جاتی تو پتہ چلتا کہ گھڑی میں فرق تھا اور مولانا بالکل وقت پر تھے، زندگی میں نہ جانے کتنی بار آندھیاں، طوفان اور بارش کا موسم بھی آیا ہوگا لیکن مولانا کے معمولات میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

مولانا کو تعلق مع اللہ بھی آخری درجہ کا حاصل تھا، بلاشبہ وہ ایک مثال ہے، بتانے والوں نے یہ بتایا کہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی تہجد فوت ہوتی ہو، راتوں میں اٹھنا، اللہ کے سامنے کھڑا ہونا، رونا اور گڑگڑانا اور اللہ سے مانگنا، یہ مولانا کی عجیب خصوصیت تھی، مولانا کا یہ مزاج تھا کہ وہ جو کام بھی کرتے تھے مواظبت کے ساتھ کرتے تھے، ایسی پابندی کرتے تھے کہ اس میں تخلف ممکن نہیں تھا، ایک دور تھا جب وہ مغرب کی نماز کے بعد "البعث الاسلامی" کے دفتر میں بیٹھتے تھے، اخیر تک مولانا کا یہ معمول قائم رہا، وہ معذوری کی حد تک پہنچ چکے تھے اور چلنا پھرنا بھی مشکل تھا لیکن اس کے باوجود نماز باجماعت کا پورا اہتمام کیا، مسجد آکر کرسی پر مکمل نماز ادا کرنا پھر دفتر جاکر "البعث الاسلامی" کے کام میں مشغول ہونا' ان کا معمول تھا۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ذمہ جو کام ہے وہ ہمیں کرنا ہے، وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کی اسی مزاج پر تربیت ہو، اساتذہ اور طلبہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور جس کے ذمہ جو کام ہو وہ اس کو پوری طرح سے انجام دے، مولانا کی زندگی کا یہ ایسا روشن سبق ہے، اگر ہم سب کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے تو واقعہ یہ ہے کہ اداروں کے لیے، تحریکات کے لیے اور انتظامی کاموں کے لیے یہ بڑی بنیادی بات ہے، آدمی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے، وقت کی قیمت کو سمجھے، وقت کی قیمت کو سمجھنے کی اگر کوئی مثال دی جاسکتی ہے اور کوئی شخصیت ہوسکتی ہے تو اس کی ایک اعلیٰ مثال حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی شخصیت ہے۔ شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ کی اس موضوع پر "قيمة الزمن عند العلماء" کے نام سے مستقل کتاب ہے، اس میں یہ بیان ہے کہ علماء نے کس طرح وقت کی قیمت کو پہچانا اور کس طرح مرتب کرکے اپنی زندگی کو انھوں نے قیمتی بنانے کی کوشش کی، ہمارے سامنے جو بہترین مثال گذری ہے وہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی ہے کہ وہ کس طرح وقت کی قیمت کو سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، امت کو اس سے فائدہ پہنچاتے تھے اور یہ امید کرتے تھے کہ ہمارے اساتذہ وطلبہ بھی اسی انداز سے اپنا وقت گذاریں اور وقت کی قیمت کو سمجھیں۔

مولانا کو قرآن مجید سے والہانہ تعلق تھا، تلاوت کا غیر معمولی اہتمام تھا، اخیر دور میں ان کا اکثر وقت تلاوت میں گذرتا تھا، دفتر کے کاموں میں مشغولیت ہوتی تھی، اس کے بعد جیسے ہی وقت ملتا تو تلاوت میں مشغول ہوجاتے تھے، جب مسجد میں نماز کے لیے تشریف لاتے تو نماز سے پہلے اور

نماز کے بعد جتنا وقت ممکن ہوتا' اس میں تلاوت کرتے تھے، مجھے معلوم ہوا کہ وہ روزانہ پندرہ پندرہ بیس بیس پاروں کی تلاوت فرمالیا کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس قدر مشغولیت کے بعد تلاوت کا ایسا اہتمام کوئی آسان کام نہیں ہے۔

حدیث سے بھی مولانا کو خاص مناسبت تھی، ابتدائی دور کی بات ہے جب ندوہ میں پریس قائم ہوا تو حدیث کے موضوع پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی متعدد کتابیں یہیں سے شائع ہوئیں، اس وقت مولانا کو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے بطور خاص یہ ذمہ داری دی، مولانا ان کتابوں کو پورے اہتمام سے چھاپنے کی کوشش کرتے تھے، پروف ریڈنگ بھی خود کرتے تھے اور اس زمانہ میں حضرت شیخ سے ان کو بڑا خاص تعلق پیدا ہوا، حضرت شیخ کے نام ان کے خطوط بھی ہیں، وہ ایک بڑا کام تھا جو الحمدللہ یہاں سے انجام پایا اور حدیث کی ایک خدمت تھی جو مولانا کے ذریعہ سے انجام پائی۔ مولانا کے والد بھی ایک بڑے محدث تھے، انھوں نے یہاں دارالعلوم میں کچھ وقت تک تدریس کے فرائض بھی انجام دیے پھر وہ گجرات میں شیخ الحدیث رہے اور اللہ نے ان سے دین کا بڑا کام لیا، حاصل یہ کہ مولانا کو حدیث کا بھی بڑا ذوق تھا، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا پھر عالم عربی کے بعض بڑے محدثین سے بھی استفادہ کیا اور ان سے اجازت حدیث لی۔ مولانا طلبہ کو جو اجازت دیتے تھے، اگر ان کی سند پر غور کیا جائے تو وہ بڑی عالی ہے، الحمدللہ ہمارے طلبہ اس سلسلہ میں بھی ان سے استفادہ کرتے تھے اور سند لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بھرپور زندگی عطا فرمائی اور انھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت میں صرف کی، انھوں نے کبھی بھی دنیا کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، ان کو اس کا موقع تھا، اگر وہ چاہتے تو دنیا جمع کر لیتے لیکن انھوں نے ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' پر عمل کیا، ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ ندوۃ العلماء بڑے سخت حالات سے دوچار ہوا، بعض مرتبہ کئی کئی مہینوں کی تنخواہ کا انتظام نہیں ہو پاتا تھا اور یہاں پڑھانے والے اساتذہ وذمہ دار حضرات کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن اس کے باوجود مولانا کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس دور میں سرمایہ کی فراہمی کے لیے مولانا نے جو کوششیں کیں وہ بھی ان کا ایک خاص امتیاز ہے اور اس سے الحمدللہ ندوۃ العلماء ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہا، مولانا اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ دارالعلوم کو جو ضرورتیں درپیش ہیں اور اس کے لیے جو سرمایہ ضروری ہے وہ اس کے لیے سفر بھی کرتے تھے، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، اس میں کبھی کبھی عزت نفس کو قربان کرنا پڑتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ آدمی اللہ کے لیے یہ کام کررہا ہے تو معمولی کام نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کا بڑا قرب حاصل ہوسکتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ''جامع الکمالات'' بنایا تھا، زبان کی مہارت، ''البعث الاسلامی'' کے اداریئے لکھنے کا اہتمام، اس کے علاوہ اہتمام کی مصروفیات پھر تدریس کا ذوق جو آخری لمحہ تک ختم نہیں ہوا، جب تک مولانا کی صحت نے ساتھ دیا وہ پڑھاتے رہے، اخیر دور کے طلبہ آج تک اس دور کو یاد کرتے ہیں، وہ طلبہ سے گھل مل جاتے تھے، ایک طرف مولانا کا جو رعب تھا اس کا ایک اثر پڑتا تھا، طلبہ کی تربیتی زندگی میں اس کا بھی ایک فائدہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ طلبہ کو قریب کرنا ہے، ان کی تربیت کرنی ہے، اس لیے وہ طلبہ کو بہت محبوب بھی رکھتے تھے۔ ہمارے ایک محترم ندوی فاضل نے تقریباً چالیس سال پرانا قصہ سنایا کہ ایک طالب علم بیمار ہوا، مولانا کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہوگئے، ان کو بلایا اور غالباً پچاس روپئے دیئے اور کہا کہ اس سے طالب علم کا علاج کراؤ۔

مولانا کے دل میں طلبہ کے لیے ایک درد تھا، ان کی یہ فکر ہوتی تھی کہ طالب علم یہاں اپنا وقت ضائع نہ کرے، وہ یہاں کے ماحول سے پورا فائدہ اٹھائے اور کچھ بن کر نکلے، یہ ادارے اسی لیے قائم ہوتے ہیں، یہاں طلبہ کو بلایا جاتا ہے، مردم سازی کا کام ہوتا ہے، افراد تیار کیے جاتے ہیں، اس وقت عالم اسلام اور اس ملک کو جس طرح کے افراد کی ضرورت ہے' اگر یہاں اس طرح کے افراد تیار نہیں کیے جائیں گے تو یہ ایک بہت بڑا خلا ہے، گویا ہم اپنے مقصد میں ناکام ہیں، اس لیے مولانا کو ہمیشہ اس کی فکر رہتی تھی کہ طلبہ اپنا وقت ضائع نہ کریں، بے ضرورت بازاروں میں نہ جائیں، غلط کاموں میں اپنا وقت نہ لگائیں، درجات کی پابندی کریں۔

مولانا جب کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے ذمہ دار تھے تو اس وقت مولانا باقاعدہ درجات کا دورہ کرتے تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ جب ''النادی العربی'' کے جلسے ہوتے تھے تو مولانا خود تشریف لاتے تھے اور نگرانی فرماتے تھے، مولانا کا ذوق یہ تھا کہ طلبہ کے اندر فکر پیدا ہو، ایسا نہ ہو کہ یہاں رہ کر طلبہ اپنے آپ کو ضائع کریں پھر جب وہ فارغ ہوں تو اپنے آپ کو کسی کام کا نہ سمجھیں اور امت کو

کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں، اسی لیے مولانا کے اندر ایک درد تھا، یہی وجہ ہے کہ جب ضرورت ہوتی تھی تو نرمی بھی اپناتے تھے اور بڑی محبت واپنائیت کے ساتھ وہ طلبہ سے معاملہ کرتے تھے۔

اسی طرح اساتذہ سے محبت کے ساتھ تربیت کا معاملہ تھا، حقیقت میں وہ معلم اجیال تھے، اس وقت شاید ہی ندوۃ العلماء کا کوئی ایسا استاد ہو جو مولانا کا شاگرد نہ ہو، اللہ نے مولانا کو یہ مقام عطا فرمایا تھا کہ وہ استاذ الاساتذہ تھے، وہ تربیت بھی کرتے تھے اور اگر ضرورت پڑتی تھی تو کہیں سختی بھی کرتے تھے، جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو صحت وقوت عطا فرمائی وہ آتے رہے اور اپنا فریضہ انجام دیتے رہے۔

ندوۃ العلماء کی ایک ایک اینٹ انھیں عزیز تھی، اگر کہیں بھی ندوہ کا کوئی نقصان ہوتا تھا تو ان کے لیے برداشت کرنا مشکل ہوتا تھا، اللہ نے انھیں یہ جو ذوق دیا تھا اور ندوہ سے جو تعلق تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ الحمد للہ ان کی ذات سے ندوۃ العلماء نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا اور پورے عالم اسلام پر اس کا اثر پڑا اور پوری عرب دنیا میں ان کی وفات کا خسارہ محسوس کیا گیا۔

ان کی وفات کے موقع پر عرب دنیا اور عرب علماء کی طرف سے جو تعزیتی پیغامات موصول ہوئے، اس سے احساس ہوتا تھا کہ لوگ ان کی شخصیت کو کس طرح تسلیم کرتے تھے، "البعث الاسلامی" کے اداریئے وہ اخیر تک لکھتے رہے اور وہ پڑھے جاتے رہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

مولانا ایک ایسی زندگی گذار کر گئے جو بھرپور زندگی تھی، ورنہ اس معذوری میں آدمی کام کا نہیں رہ جاتا، لیکن مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ مستقل فکرمند رہتے تھے، میں ان کی خدمت میں مسلسل حاضر ہوتا رہتا تھا، اتفاق کی بات ہے کہ وفات سے ایک دن قبل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت اندازہ ہوا کہ مولانا کو آج بھی کس طرح فکر ہے، وہ مجھ سے ندوہ کے بارے میں ضرور پوچھتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں ذوق تصنیف عطا فرمایا تھا، الحمد للہ ان کی متعدد تصانیف ہیں، عربی زبان میں بھی اور اردو میں بھی، اس کے علاوہ بہت سی تصانیف کے دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہیں، "شعراء الرسول ﷺ" کے عنوان پر انھوں نے ایک مقالہ لکھا جس پر انھیں باقاعدہ ندوۃ العلماء سے ڈاکٹریٹ کی سند دی گئی، ان کا یہ مقالہ حقیقت میں ایک وقیع اور محققانہ کام ہے، اللہ کے نبی ﷺ کے زمانہ میں وہ شعراء جنھوں نے آپ ﷺ کی شان میں نعتیں کہیں اور دین کا دفاع کیا، ان میں سرفہرست حضرت حسان بن ثابتؓ ہیں، مولانا کی یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی، اس کے علاوہ ان کی درجنوں کتابیں ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ "ساعۃ مع العارفین" بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے، اللہ کے جو خاص بندے گذرے ہیں ان کے بارے میں مولانا نے مضامین لکھے اور ان کا تعارف کرایا، بلاشبہ یہ بھی ہماری زندگی اور تربیت کا ایک اہم حصہ ہے، اگر ہم اپنے بڑوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کریں گے اور ان کی شخصیت سے واقف نہیں ہوں گے تو اپنی زندگی کی صحیح تعمیر نہیں کر سکتے، عربی زبان میں ان کی یہ کتاب جس میں اللہ کے خاص بندوں کا تذکرہ ہے بڑی اہمیت کی حامل ہے، اللہ کا فضل ہے کہ آج وہ خود بھی انھی شخصیات میں شامل ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ذوق عبادت عطا کیا تھا، اپنی معرفت سے نوازا تھا، اسی کے ساتھ تبلیغ ودعوت اور فکر اسلامی کو پیش کرنے کا انھیں ملکہ عطا فرمایا تھا، انھوں نے جس طرح اس ادارہ کی سربراہی اور خاص طور سے اخیر میں پوری طرح سرپرستی فرمائی، یقیناً یہ ان کے لیے سرمایہ اور ذخیرۂ آخرت ہے۔

تعلیمی میدان میں مولانا کے بہت سے کارنامے ہیں، Integral University جو قائم ہوئی، میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بڑا ہاتھ حضرت مہتمم صاحب کا ہے، ان کی فکروں اور توجہات کا ہے، اگر وہ نہ ہوتے تو شاید یونیورسٹی پوری طرح اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو پاتی لیکن انھوں نے اس کی فکر کی، انشاء اللہ یہ کام بھی ان کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا، اس کے علاوہ درجنوں ایسے تعلیمی ادارے تھے جن کی وہ سرپرستی فرماتے تھے اور ان اداروں کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچتا تھا لیکن ندوۃ العلماء ان کے لیے ایک جان کی حیثیت رکھتا تھا، سب سے زیادہ اس کی فکر ان کو رہتی تھی، اس ادارہ کو ترقی دینے کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند رہتے تھے، یہ ان کی زندگی کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلا لیا، اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کے والد صاحب بڑے عالم ومحدث تھے اور ان کے بڑے بھائی مولانا عزیز الرحمن صاحب اعظمیؒ بھی بڑے حکیم وعالم تھے، اللہ نے انھیں بھی عمر طویل عطا فرمائی، مولانا کے ایک چھوٹے بھائی مولانا مسیح الرحمن صاحب ابھی حیات ہیں اور صاحب علم آدمی ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اللہ نے انھیں ایک علمی خاندان میں پیدا کیا تھا لیکن سب سے بڑھ کر خود ان کی اپنی ایک شخصیت تھی جس نے ایک تعارف کرایا، صرف ان کا ہی نہیں بلکہ ان کے خاندان کا اور ندوۃ العلماء کا بھی، میں سمجھتا ہوں کہ ندوہ کی تعمیر وترقی میں ان کا ایک بڑا حصہ ہے، میں نے شروع ہی میں یہ بات عرض کی ندوہ کی تاریخ میں ان حضرات کی بڑی

خدمات ہیں، خاص طور پر حضرت مہتمم صاحب کی قربانیاں اور ان کی خدمات مثالی ہیں، اس دور کی جب تاریخ لکھی جائے گی اور ان چند لوگوں کے نام لکھے جائیں گے جنھوں نے ندوۃ العلماء کو ترقی دینے اور اس کو آگے بڑھانے میں بڑا کردار ادا کیا اور ان کا ایک بڑا اہم حصہ ہے تو ان میں ایک بہت نمایاں نام حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمیؒ کا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ان تمام خدمات کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔

یاد رکھئے! ہمارا کام ان جانے والوں کا صرف تذکرہ کر لینا نہیں ہے، ہمیں حکم ہے "اذکروا محاسن موتاکم" (جانے والوں کی خوبیوں کا تذکرہ کرو۔)

اس تذکرے کے دو فائدے ہیں: پہلا فائدہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ ایک گواہی ہے جس کا ذکر حدیثوں میں آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کہیں گے کہ دنیا میں اتنے لوگ ہیں جو تمہارے محاسن کا تذکرہ کرتے ہیں اور تمہاری خوبیوں کی گواہی دیتے ہیں۔ دوسرے اس میں ہمارے لیے ایک بڑی سوغات یہ ہے کہ ہم ان خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں، ہم ان خوبیوں کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کریں اور یہ طے کریں کہ جانے والے چلے گئے، انھوں نے اپنا راستہ ہموار کیا اور اب وہ اپنی منزل کو پہنچ گئے جہاں اپنی محنتوں کا پھل پائیں گے۔

ضرورت ہے کہ ہم ان کے راستے پر چل کر ان کی بلند صفات کو اختیار کر کے اپنے اندر قوت عمل پیدا کریں اور جفاکشی کے ساتھ وقت گذاریں پھر میدان عمل میں آکر یہ کوشش کریں کہ آج امت کو جس طرح افراد کی ضرورت ہے، اس کو پورا کریں گے، اگر خدانخواستہ ہمارا یہ وقت غفلت میں گذرا تو یہ امت آخر کہاں جائے گی؟

یہ آپ کی منتظر ہے، زمانہ آپ کا منتظر ہے، ساری دنیا آپ کی منتظر ہے۔ ابھی مجھے مختلف ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں آج ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے افراد کار کی جن کے اندر وسعت فکر ہو، جن کے اندر رسوخ فی العلم ہو، جن کے اندر دعوت کا جذبہ ہو، جن کے اندر بات کہنے کا سلیقہ ہو، زباں دانی ہو اور مختلف زبانوں میں ان کو مہارت حاصل ہو۔ مختلف علاقوں میں مجھ سے لوگوں نے یہ بات کہی، ایسے لوگوں نے جو ندوۃ العلماء کے فارغ نہیں ہیں لیکن انھوں نے یہاں کے نظام تعلیم سے جو اثر قبول کیا، اس کے نتیجہ میں کھل کر انھوں نے یہ بات کہی کہ آج عالم اسلام کو سب سے بڑھ کر ندوۃ العلماء کی فکر کی ضرورت ہے، یہاں کے نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔

آج آپ پر یہ ایک امانت ہے، اگر آپ یہ طے کریں کہ ہمیں انشاء اللہ اس کے لیے تیاری کرنی ہے تو آپ صرف اس ملک کی حد تک نہیں بلکہ عالم اسلام اور اس سے بڑھ کر ساری دنیا میں ان شاء اللہ اسلام کی نمائندگی کرنے والے ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ندوۃ العلماء اسلام کی بہترین تصویر پیش کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے، اللہ نے ہمیں جو فکر دی، ہمارے بڑوں نے جو طریقہ ہمیں بتایا اور انھوں نے ہماری جس طرح تربیت کی، اس کی بنیاد پر ہماری بڑی ذمہ داری ہے، الحمد للہ اساتذہ آپ کی تربیت کرتے ہیں اور آپ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ آپ میدان میں آکر اپنے بڑوں کے راستے پر چلیں گے، جس طرح انھوں نے عربی زبان میں مہارت پیدا کی، اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے انگریزی زبان میں کمانڈ پیدا کی، پھر انھوں نے دنیا کو تج دیا، انھوں نے دنیا کو پیچھے چھوڑ کر کوشش کی اور ساری دنیا کو فائدہ پہنچایا، علمی اعتبار سے، دینی اعتبار سے، فکری اعتبار سے اور دعوت کے میدان میں انھوں نے ایک ایسی خدمت انجام دی جس سے الحمد للہ عالم اسلام نے فائدہ اٹھایا اور فائدہ اٹھا رہا ہے۔

آج آپ کے ذمہ یہ ایک امانت ہے، ایک ایک طالب علم یہ طے کر لے کہ ہمیں ان بڑوں کی سیرت وحالات کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کو سنوارنے کی ضرورت ہے، "محاسن موتی" کا تذکرہ صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ ہم تذکرہ کر کے فارغ ہو جائیں، یہ اس لیے ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں اور ان محاسن کو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

میں نے درجنوں جگہ یہ بات کہی کہ ندوۃ العلماء کا یہ امتیاز ہے کہ ایک طرف تصلب ہے اور دوسری طرف توسع، یہ دونوں بنیادی باتیں ہیں، اگر تصلب کی جگہ توسع پیدا ہو جائے گا تو انحراف پیدا ہوگا اور اگر خدانخواستہ توسع کی جگہ تصلب پیدا ہو جائے گا تو امت میں انتشار پیدا ہوگا۔ ہمیں درمیان کا جو جادۂ اعتدال ہے اس پر چلنا ہے، ہمارے بڑوں اور بزرگوں نے اسی راستے پر ڈالا اور یہی ہماری ذمہ داری ہے اور یہی پیغام ہے ان حضرات کی ان صفات ومحاسن کا جن کا ذکر کیا جا رہا ہے، حقیقت میں یہ اسی لیے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔

میں اخیر میں آپ سے پھر یہی بات کہتا ہوں کہ زمانہ آپ کا منتظر ہے، آپ وہ صفات پیدا کریں، جس طرح ہمارے بڑے کام کر کے چلے گئے اور اللہ کی بارگاہ میں سرخ رو ہو گئے، اب زمانہ آپ کا منتظر ہے، صرف زمانہ ہی نہیں خود آپ منتظر ہیں، آپ کا خاندان منتظر ہے کہ آپ بھی ان شاء اللہ سرخ

روہوں گے، آپ بھی ان صفات کو آراستہ کر کے اپنی زندگی کو بنا کر اور ہر طرح کے ان خرخشوں، جنجالوں اور رکاوٹوں سے الگ رہ کر اپنے آپ کو اس منزل تک لے جائیں گے جو ہماری اصل منزل ہے اور جس کی اس وقت دنیا کو ضرورت ہے۔

اگر آپ یہ کوشش کرلیں گے اور ان صفات کو اختیار کرلیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا آپ کے ساتھ خاص فضل بھی ہوگا اور یہی حق ہے ان جانے والوں کا کہ ہم ان کی صفات سے فائدہ اٹھائیں، اگر ہم ان کی صفات کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی اس کے مطابق بنائیں گے تو یقیناً یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ بھی ہوگا کہ ہم نے ان کی زندگی سے روشنی حاصل کی، جانے والا جاتا ہے، روشنی چھوڑ کر جاتا ہے اور راستہ چھوڑ کر جاتا ہے، ہمیں ان جانے والوں کے راستے پر چلنا ہے۔

بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جنھوں نے ندوۃ العلماء کی فکر پیش کی، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ جن کو معمار ندوۃ العلماء کہا جاتا ہے، حضرت مولانا عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے ندوۃ العلماء کو سنبھالا اور آگے بڑھایا، علامہ سید سلیمان ندویؒ جو ندوہ کے سب سے بڑے ترجمانوں میں ہیں، پھر اخیر میں ہمارے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ جنھوں نے پوری دنیا میں ندوہ کا تعارف کرایا اور اس کے بعد حضرت مولانا رابع صاحبؒ، حضرت مولانا واضح صاحبؒ اور حضرت مولانا سعید الرحمن صاحبؒ جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کام کے لیے قبول کیا، یہ حضرات حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے دست وبازو بنے اور ان کے ذریعہ سے ایک تحریک برپا ہوئی اور اس سے دنیا نے فائدہ اٹھایا، آج پھر ضرورت اسی بات کی ہے کہ ہم ان حضرات کی زندگیوں اور قربانیوں کو دیکھ کر، ان کے علم کی بلندی کو اور ان کی فکر کی پختگی کو دیکھ کر، ان کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اور اس سے بڑھ کر ان کی زندگی کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی کو انشاء اللہ ایسا بنائیں گے کہ ہم بھی ایک نمونہ کی زندگی لوگوں کے سامنے رکھ سکیں تاکہ جب میدان عمل میں آئیں تو ہم تہی دامن نہ سمجھے جائیں۔

اگر آج آپ نے کوشش کرلی اور آج آپ یہ امانت لے کر یہاں سے گئے کہ انشاء اللہ ہمیں ان شخصیات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنا ہے اور ساری دنیا میں ہمیں دین کا پیغام پھیلانا ہے، یاد رکھیے! اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں انتخاب ہوتا ہے، اگر آپ تیاری کریں گے اور محنت کریں گے تو اللہ آپ کا انتخاب کرے گا، اللہ آپ سے وہ کام لے گا جو ان بڑوں سے لیا جو اس دنیا سے جا چکے، وہ {فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ} (تو بعضوں نے اپنا ذمہ پورا کردیا) کا مصداق ہیں اور {وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُ} (اور بعض انتظار میں ہیں) کا مصداق آپ حضرات ہیں، اگر آپ انشاء اللہ اس کام کو کریں گے تو کل اللہ آپ کو بھی اسی صف میں شامل کرے گا اور وہاں کی سرخ روئی آپ سب کو عطا فرمائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا کے درجات کو بلند فرمائے، انھوں نے پوری زندگی کھپا دی اور اخیر دور جوان کی معذوری کا رہا، اس وقت بھی ان کی دعائیں، ان کی سرپرستی اور ان کی فکر نے ہم سب کو فائدہ پہنچایا، اللہ اس سلسلہ کو قائم رکھے اور ان کی دعاؤں کو اس ادارہ کے لیے اور آپ کے لیے قبول کرے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے یہ بندے، یہ بزرگان دین اور یہاں کے ذمہ دار آپ کے لیے روتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین کا کام لے، آپ نمائندہ بن کر میدان عمل میں آئیں اور دنیا کو جو ضرورت ہے وہ آپ سے پوری ہو۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے، ندوۃ العلماء کی حفاظت فرمائے، بہتر سے بہتر افراد کار مہیا فرمائے، جو حضرات یہاں موجود ہیں اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر طریقہ پر ان کو تیار فرمائے اور ان کے ذریعہ سے عالم میں ہدایت وخیر کا کام لے۔ آمین!

(ضبط وپیش کش: محمد ارمغان بدایونی ندوی)

☆☆☆

دعائے مغفرت

دفتر مالیات دار العلوم ندوۃ العلماء کے کارکن بھائی احمد میاں کی والدہ ماجدہ ۴/ربیع الاول ۱۴۴۸ھ مطابق ۱۸/اگست ۲۰۲۶ء کو مالک حقیقی سے جا ملیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ انگریزی مولانا انوار الحسن ندوی مرحوم کی بیوہ تھیں، مولانا کا انتقال ۱۹۷۰ء میں رائے بریلی کے تکیہ کلاں کی سئی ندی میں ڈوب کر ہو گیا تھا اور وہیں سپرد خاک بھی ہوئے تھے۔ مرحومہ نے رضائے الٰہی کیلئے قناعت کی زندگی بسر کی، وہ نیک سیرت اور صوم وصلاۃ کی پابند، اور علاقہ میں باجی کے نام سے مشہور تھیں۔ نماز جنازہ احاطۂ دار العلوم میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی مدظلہ نے پڑھائی۔

پسماندگان میں ایک بیٹا احمد میاں اور چار بیٹیاں ہیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

تعلیم الحدیث

موت کے بعد بھی جاری رہنے والی نیکیاں

مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: »إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ«. (صحیح مسلم: ۱۶۳۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے، یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

تشریح: انسان کی زندگی عمل کی مہلت ہے، اور موت اس مہلت کے ختم ہو جانے کا نام ہے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد انسان خود کوئی نیا عمل نہیں کر سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نیکی کے ایسے راستے کھلے رکھے ہیں جن کے اثرات وفات کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور اس کے لیے اجر کا ذریعہ بنتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں ایسے کام کر جائے جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا رہے تو ان کے اثرات اس کی عمر سے کہیں آگے تک پہنچ سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ﴾

یعنی ہم مردوں کو زندہ کریں گے، اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور جو اثرات اپنے پیچھے چھوڑے، سب لکھتے جاتے ہیں، اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال کے ساتھ اس کے چھوڑے ہوئے اثرات بھی اللہ تعالیٰ کے علم وحساب میں ہیں۔ اس لیے یہ دیکھنا اہم ہے کہ انسان اپنے بعد دنیا میں کیا چھوڑ کر جاتا ہے۔

حدیث مبارک میں باقی رہنے والے اعمال میں علمِ نافع کا خصوصی ذکر ہے۔ علم انسان کی فکر کو درست کرتا، اس کے کردار کو سنوارتا اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر چلنے میں مدد دیتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کو دین کی صحیح بات سکھاتا، اس کی تربیت کرتا یا اسے نیکی کی راہ دکھاتا ہے تو اس کا فائدہ اسی شخص تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ آگے دوسروں کو سکھانے اور ان کی اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔ یوں خیر کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کے آغاز کرنے والے کے لیے بھی اجر کی امید باقی رہتی ہے۔

حافظ بدر الدین ابن جماعہؒ نے اپنی مشہور کتاب **تذكرة السامع والمتكلم في أدب العالم والمتعلم** میں اسی حدیث کی روشنی میں معلم علم کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں مذکور تینوں فضیلتوں کے معانی ایک معلمِ علم میں جمع ہو جاتے ہیں۔ استاد کا شاگرد کو علم سکھانا صدقۂ جاریہ کی طرح ہے، کیونکہ اس علم کا فائدہ آگے تک پہنچتا ہے۔ علمِ نافع کی صورت بھی واضح ہے کہ شاگرد اس علم سے خود فائدہ اٹھاتا اور دوسروں تک بھی پہنچاتا ہے۔ پھر اہلِ علم اپنے اساتذہ اور مشائخ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں، جس سے استاد کو اس دعا کا فائدہ بھی پہنچتا ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔

یہ بات ایک عالم دین کی زندگی اور خدمات کو سمجھنے میں خاص طور پر اہم ہے۔ ایک عالم کی زندگی صرف ان برسوں تک محدود نہیں جن میں وہ درس دیتا یا لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے؛ اس کی علمی وتربیتی محنت کے اثرات بعد میں بھی جاری رہتے ہیں۔ اس کی تصنیف وتالیف سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، شاگرد علم کو آگے پہنچاتے ہیں اور تربیت یافتہ افراد دوسروں کی اصلاح کرتے ہیں۔ یہ سب اس کے لیے اجر کے اسباب بنتے ہیں، بشرطیکہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوں اور ان سے واقعی نفع حاصل ہو۔

صدقۂ جاریہ اور نیک اولاد بھی اسی تسلسل کی صورتیں ہیں۔ کوئی شخص مسجد، مدرسہ، کنواں یا ایسا فلاحی کام چھوڑ جائے جس سے لوگ مسلسل فائدہ اٹھاتے رہیں تو وہ اس کے لیے اجر کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی طرح نیک اولاد کی دعا والدین کے لیے بڑی نعمت ہے۔ ان تینوں صورتوں میں مشترک بات یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں کی ہوئی محنت کا نفع اس کی وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

فائدہ: اس حدیث کا پیغام ہر شخص کے لیے ہے، لیکن اہلِ علم کے لیے اس میں خاص سبق ہے کہ علم کو اپنے تک محدود نہ رکھیں، بلکہ دوسروں تک پہنچائیں؛ شاگردوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی کریں؛ اور ایسے علمی و دینی کام کریں جن سے آنے والی نسلیں بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی طرح ہر مسلمان کو اپنی استطاعت کے مطابق خیر کا کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس کا فائدہ اس کی زندگی کے بعد بھی جاری رہے۔

☆☆☆

تعلیم الفقہ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: جب انسان قریب مرگ ہو تو اسے کس طرح لٹایا جائے؟ اس بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ رہنمائی کریں، کیونکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ میت کو اس طرح لٹاتے ہیں کہ پاؤں قبلہ رخ ہوتا ہے، جو خلاف ادب معلوم ہوتا ہے؟

جواب: جب انسان کے انتقال کا وقت قریب ہوجائے تو اسے قبلہ رخ کردینا چاہیے، قبلہ رُخ کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جیسے سوتے وقت داہنی کروٹ سونا مسنون ہے، اسی طرح داہنی کروٹ لٹادیا جائے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چت لٹادیا جائے اور پاؤں اور چہرہ دونوں قبلہ رخ ہو، چہرہ کو قبلہ رخ کرنے کے لیے سر کے نیچے کچھ رکھ دیا جائے تاکہ سر اونچا ہوجائے اور چہرہ قبلہ کی طرف متوجہ ہو، اس صورت میں پاؤں قبلہ رُخ ہوتا ہے، لیکن اصل مقصود پاؤں کو قبلہ رخ کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ چہرہ کو قبلہ رخ کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے یہ قبلہ کی بے ادبی نہیں؛ بلکہ قبلہ کی طرف رخ کرنا ایک علامتی عمل ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

[ردالمحتار: ج ۳/ص ۷۸]

سوال: کیا میت کے قریب قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: میت کو جب تک غسل نہ دیا جائے اس وقت تک وہ ناپاک ہے، اس لیے غسل سے پہلے میت کے قریب قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے، البتہ غسل دینے کے بعد پڑھ سکتے ہیں۔

[کبیری، ص/ ۵۳۳]

سوال: میت کو رشتہ داروں کے انتظار میں دیر تک رکھتے ہیں، کبھی کبھی ایک دن اور ایک رات کا وقفہ ہوجاتا ہے، ایسا کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: کسی کے انتقال کے بعد تدفین میں جلدی کرنا چاہیے، رشتہ داروں کے انتظار میں زیادہ دیر تک میت کو روکے رکھنا پسندیدہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی تدفین میں تاخیر کرنے کو ناپسند فرمایا ہے، حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرنا! نماز جب وقت ہوجائے، جنازہ جب آجائے اور نکاح جب لڑکی کے لیے مناسب رشتہ آجائے۔

[جامع ترمذی/ حدیث ۱۰۷۵]

سوال: شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کا اس کے چہرہ کو دیکھنا یا جسم کو ہاتھ لگانا، اسی طرح بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کا اس کے چہرہ کو دیکھنا یا اس کے جسم کو ہاتھ لگانا درست ہے یا نہیں؟

جواب: بیوی کے لیے شوہر کے انتقال کے بعد اس کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا جائز ہے اور اگر ضرورت ہو تو غسل دینے کی بھی اجازت ہے کیونکہ شوہر کے انتقال کے بعد جب تک عدت وفات گذر نہ جائے ایک حد تک وہ اس کے نکاح میں رہتی ہے، اس لیے اس کے لیے دیکھنے، چھونے اور بوقت ضرورت غسل دینے کی اجازت ہے، لیکن شوہر کے لیے بیوی کے انتقال کے بعد اس کو غسل دینا اور چھونا جائز نہیں ہے کیونکہ مرنے کے بعد وہ ایک اجنبی عورت کے حکم میں ہوجاتی ہے، البتہ چہرہ دیکھنے کی اجازت ہے، علامہ حصکفیؒ نے صراحت کی ہے: "**یمنع زوجها من غسلها و مسها لا من النظر الیها علی الأصح**" (شوہر کو فوت شدہ بیوی کو غسل دینے اور چھونے سے روک دیا جائے لیکن اصح قول کے مطابق دیکھنے سے منع نہیں کیا جائے گا)۔

[الدر المختار علیٰ رد المحتار: ج ۱/ص ۲۶۸]

سوال: کفن پر کلمہ طیبہ لکھنا کیسا ہے؟ کیا حدیث میں اس کی کوئی فضیلت آئی ہے؟ کیا یہ منع تو نہیں ہے؟

جواب: کفن پر کلمہ طیبہ لکھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے، فقہاء نے کفن پر اس کو لکھنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس میں کلمہ طیبہ کی بے حرمتی ہوتی ہے، بسا اوقات نعش پھول پھٹ جاتی ہے، جس سے کفن آلودہ اور ناپاک ہوجاتا ہے، اس لیے اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

[ردالمحتار: ج ۱/ص ۲۶۸]

سوال: کیا مردوں کو سفید کے علاوہ کوئی رنگین کفن دیا جاسکتا ہے؟

جواب: مردوں کو سفید کپڑے کا کفن دینا افضل ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ کپڑا سفید کپڑا ہے، جو لوگ زندہ ہیں وہ سفید کپڑے کو اپنا لباس بنائیں اور مردوں کو ایسے ہی کپڑوں میں کفن دیا جائے۔ [مستدرک حاکم/ حدیث ۱۳۰۹]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رنگین کپڑوں کے بجائے سفید کپڑوں میں کفن دیا جائے۔

☆☆☆

دینِ حق

اسلام کے علاوہ کوئی راہِ نجات نہیں

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء)

مسلمان دوسری قوموں سے کئی اعتبار سے مختلف ہیں، پہلی وجہ اختلاف یہ ہے کہ: مسلمان زمانہ ماضی میں سامراجی عہد سے پہلے دنیا کی ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ افریقہ اور یورپ کے متعدد ملکوں پر حاکم تھے اپنے عہدِ اقتدار میں انھوں نے زندگی اور فکر وفن کے بہت سے میدانوں میں زندہ جاوید نقوش چھوڑے ہیں اور وہ اس قابل فخر تاریخ پر ناز کرتے ہیں اور وہ اپنے قائدین علماء اور اپنی تاریخ کی مایہ ناز شخصیتوں پر فخر کرتے ہیں ان کے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اپنی عزت و قیادت کے عہد کو بھول جائیں جو موجودہ عہد سے جڑا ہوا ہے اور اس کا تعلق ماضی کے ہزاروں سال قبل کے عہد سے نہیں، وہ مستقل تہذیب کے حامل ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ دین جسکی طرف مسلمان اپنے کو منسوب کرتے ہیں وہ دین برحق ہے اور مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ مکمل ترین دین ہے اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے رہنمائی موجود ہے وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ خود اس دین کے حامل ہونے کی وجہ سے سب سے بہتر امت ہیں یہ ایک فطری احساس ہے اس کے لیے کئی چیزیں وجہ جواز بن سکتی ہیں یہ دین عہد قریب میں دوسرے ادیان اور نظریات پر غالب آیا اس دین اور اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے ذلت ومسکنت اور مصیبت وجلاوطنی کی حالت سے نکل کر عزت وحکومت حاصل کی، اس دین نے صرف بدو وحشی قبائل ہی کی زندگی نہیں بدلی بلکہ اس کا سایہ ایشیائے کوچک اور افریقہ کے وحشی قبائل تک پھیل گیا جو قبیلے وحشی جانوروں کی طرح زندگی بسر کررہے تھے، ان کی زندگی نظام وقانون سے عاری تھی، ان کا شعار ڈاکہ زنی اور لوٹ وکھسوٹ تھا، ان قبیلوں نے جب اسلام قبول کرلیا اور وہ اسلام کے سائے میں آگئے تو انسانی رہنمائی کے معیار اور علمی قیادت کے منصب پر پہنچ کر صدیوں تک دنیا کے قائد بنے رہے اور انھوں نے اس وقت کے متمدن ترین ملکوں کی قیادت سنبھالی اور ان کو تہذیب کا درس دیا ان علاقوں میں موجودہ یورپ کے متعدد ممالک تھے، اس نئے دین نے کئی صدیوں سے آپس میں لڑنے والوں کو ایک قوم بنایا اور ان کی مشکلات کو حل کیا اور ان کے دلوں کو منشرح کیا اور ان پر جو بیڑیاں پڑی تھیں ان سے آزاد کیا ان میں مفکر، فلسفی، مدبر اور اقتصادیات کے ماہر پیدا ہوئے جنھوں نے دور دراز علاقوں کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالی اور عصبیت، قومیت اور انانیت سے نجات دلائی جو کہ مختلف گروہوں اور نسلوں میں تفریق کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ دنیا کی ہر نوع کی صلاحیتیں، علم وفن اور عقل و دانش کا جوہر اسلامی دار الحکومت میں جمع ہوگیا اور تمام کوششیں اس دین کے سائے میں پروان چڑھیں۔

یہ دین جس کی طرف مسلمان اپنا انتساب کرتے ہیں آگے بڑھنے، جہاد ودعوت اور اخلاق کا دین ہے وہ ایسی طاقت سے مالا مال ہے جو ہر جامد چیز میں زندگی کی روح پھونک دیتی ہے اس دین پر عمل کرکے مسلمان داعی اور معلم اخلاق بن کر اپنے علاقوں سے نکلے اور ظلم واستبداد کی طاقتوں سے لوہا لیا اور جو اللہ کے راستے میں نکلے انھوں نے گوشہ نشینوں کے مقابلے میں اعلی درجہ حاصل کیا اور جو تحصیل علم کے راستے میں نکلے انھوں نے زاہدوں اور گوشہ نشینوں کے مقابلے میں اعلی درجہ حاصل کیا، انسان کو ظلم وتاریکی سے نکالنے اور ایک انصاف پسند معاشرہ کو وجود میں لانے، نیز اللہ تعالی کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے علم حاصل کیا اور دور دراز علاقوں میں پھیل گئے اس کے لیے اپنی جانیں دیں اپنا مال خرچ کیا اور باطل کا مقابلہ کیا۔

یہ دین تواضع، سادگی اور نفس کے محاسبے اور ایثار کا دین ہے اور ان طاقتوں سے مقابلہ کرنے کا دین ہے جو غرور، گھمنڈ اور قومی فخر پر قائم ہوں اور ایک نسل کی دوسری نسل پر برتری کا احساس رکھتی ہوں اور ان میں انسانوں کی مختلف نسلیں ایک دوسرے کی برابری نہ کرسکتی ہوں یہ دین تمام میدانوں میں بنیادی انقلاب کا علمبردار ہے۔

دنیا میں دین وحکومت اور دین اور علم کے درمیان فاصلہ پایا جاتا تھا اسلام نے ایسے میدانوں میں وحدت قائم کی جو ایک دوسرے کے برعکس سمجھے جاتے تھے، اسلامی تاریخ میں اسے متعدد حاکم پیدا ہوئے جو عظیم شہنشاہتوں کے مالک ہونے کے باوجود اپنی زندگی میں زاہد تھے اپنے ہاتھ کی کمائی پر زندگی بسر کرتے تھے اور اللہ کے خوف سے ان کے قلوب معمور تھے یہ ایک بے مثال اتحاد تھا اسلامی تاریخ میں بہت سے فرمانرواؤں کی مثالیں موجود ہیں جو بیک وقت حاکم بھی تھے اور زاہد بھی تھے۔

اس دین نے فقیر وغنی کے درمیان وحدت قائم کی اور یہ ایک ایسی وحدت ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی یعنی مالدار فقیر اور فقیر غنی اور ان مالدار فقراء اور فقراء مالدار کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بہت ہیں اس دین نے انسانیت کی بھلائی میں ایک اور انقلاب برپا کیا اور وہ ہے علم اور نفی علم کے درمیان وحدت پیدا کرنا، اس نے یہ کہہ کر علم کے غرور اور گھمنڈ کو ختم کردیا {وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا} (تمہیں صرف تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے) چوٹی کے عالموں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ مجھے اس کا علم نہیں، اس تصور نے حصول علم کا دروازہ کھول دیا اس دین نے کمزور اور طاقت ور مالدار اور غریب کے درمیان فاصلہ کم کیا اور ایک دوسرے کے درمیان محبت اور تعاون کا جذبہ پیدا کیا جو اس دین پر فخر کرتا ہے اس کا فخر بجا ہے اور یہ دین اس شخص کے لیے عزت وبزرگی کا سرچشمہ ہے جو اس کو اپناتا اور اس پر کاربند ہوتا ہے۔

یہی وہ دین ہے جو غالب رہنے والا ہے اور جس نے اس کو تھام لیا اور اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہوا اور اس کو اپنی زندگی کا رہنما قرار دیا وہ بھی غالب رہنے والا ہے جس طرح یہ دین دوسرے ادیان پر فوقیت رکھتا ہے اسی طرح سے مسلم کی زندگی دوسروں کی زندگیوں پر فوقیت رکھتی ہے مسلمان اپنے لباس، کھانے پینے کے انداز اور اپنے اخلاق عالیہ اور اپنے غصہ وسکون اور فقر و حکومت اپنے اپنے خشوع وخضوع اور اپنے حق کے حصول اور طاعت میں دوسرے ادیان کے لوگوں سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے جس طرح سے اس کا دین دوسرے ادیان سے مختلف ہے اس لیے ہمیشہ مسلمان اپنے دین پر عمل کرنے کے اعتبار سے عزت وذلت کا مستحق ہوتا ہے۔

لیکن آج مسلمان کی زندگی بدل گئی ہے وہ اس برتر دین کی طرف اپنے کو منسوب کرتا ہے لیکن دین زندگی کے مختلف معاملات میں جس طرز عمل کا اس سے مطالبہ کرتا وہ اس سے کوسوں دور ہے اور وہ اپنی زندگی کے گذارنے اور اپنی مشکلات کے حل کرنے میں یہاں تک کہ دعوت وجہاد سلسلے میں بھی اس فکر وعمل اور طریقہ کار کو اختیار کرلیتا ہے جو دعوت وجہاد کے دشمن اس کے لیے پیش کرتے ہیں اس کا اللہ کی طرف دعوت دینا بھی آمیزش سے خالی نہیں ہے اس کی دعوت موجودہ غیر اسلامی دعوتوں سے متاثر ہے اور وہ اپنی زندگی میں وہی وسائل اختیار کرتا ہے جو عصر حاضر کے باطل افکار کے پھیلانے والے اختیار کرتے ہیں اور اپنے کام کی انجام دہی میں ان ہی لیڈروں اور رہنماؤں کی پیروی کرتا ہے جن کا اخلاق ودین سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے اس لیے موجودہ عہد کا مسلمان اسلامی تعلیمات کے بجائے غیر اسلامی طرز عمل پر عامل ہے اس لیے اس کی جدوجہد کے نتائج مختلف ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی ان مشکلات کے حل کرنے کے لیے جو اس کے دشمنوں کی پیدا کردہ ہیں اور اپنی زندگی کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اسی طریقہ کار کو اختیار کرتا ہے جس کو اس کے مخالفوں نے اس کے لیے تجویز کیا ہے، یہ ایک عجیب وغریب صورتحال ہے، یہ حقیقت میں احسان فراموشی ہے اور یہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے اور یہی انحراف ونافرمانی مسلمانوں کی شکست وبدحالی اور ذلت ومشکلات کا سب سے بڑا سبب ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مہتمم صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی وفات ملت اسلامیہ کے لیے بڑا سانحہ ہے، ندوۃ العلماء اپنے سرپرست سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کے درجات بلند فرمائے اور ان کی خدمات کا ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے۔

مولانا کی وفات کے بعد منصب اہتمام کے لیے کارگزار مہتمم مولانا عبد العزیز خلیفہ بھٹکلی ندوی کو مقرر کیا جاتا ہے، مولانا نصف صدی سے زائد عرصہ سے ندوۃ العلماء کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں اور حضرت مہتمم صاحب کی علالت کے دوران کارگزار مہتمم کی حیثیت سے وہ بخوبی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

نیابت اہتمام کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء کے سینئر استاذ مولانا نیاز احمد ندوی کو مقرر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خیر وبرکت کا ذریعہ بنائے، (آمین)۔

(بلال عبد الحی حسنی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۵/ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ
۸/اکتوبر ۲۰۲۶ء

جہانِ مسلم

چین میں اسلام اور مسلمان

ماضی اور حال کے آئینہ میں

مولانا سید عنایت اللہ ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

چین دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ چین میں مسلمانوں کی آمد دو طرف سے ہوئی: سمندری راستے سے ملک کے جنوب مشرقی حصے میں اور خشکی کے راستے سے شمال مغربی حصے میں۔ جنوب مشرقی حصے میں آنے والے عرب مبلغ اور تاجر تھے اور شمال مغربی حصے میں آنے والے ترک فوجی تھے۔

ایک برطانوی مؤرخ ویلس نے اپنی کتاب مختصر تاریخ عالم میں لکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ۶۲۸ء میں جس طرح ایران، روم وغیرہ کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے لیے خطوط لکھے تھے، اسی طرح چین کے بادشاہ کے پاس بھی اسی مضمون کا خط ارسال فرمایا تھا۔ اس وقت تانگ خاندان کا بادشاہ تائی چونگ چین کا حکمراں تھا۔ خط لے کر جانے والے چار صحابی تھے: (۱) وقاص، (۲) وہب، (۳) انس، (۴) حسین۔ یہ حضرات طویل سمندری سفر طے کر کے ۶۳۲ء میں چین پہنچے اور بادشاہ تائی چونگ کو اللہ کے رسول ﷺ کا مراسلہ دیا۔ تائی چونگ نے اس خط کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد ان سفیروں کا اچھی طرح استقبال کیا، خود تو ایمان نہیں لایا، البتہ ساحلی شہر کنتن (کوانگ چو) میں ایک مسجد تعمیر کروادی اور ان چاروں کو چین میں رہ کر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے کی اجازت اور مکمل سہولت مرحمت فرما دی۔ یہ چاروں وہیں چین میں رہ گئے اور اسلام کی اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔

جنوب مشرقی شہروں کو اپنا تبلیغی مرکز بنایا: ایک نے شہر کنتن میں، دوسرے نے شہر یانگ چاؤ میں اور تیسرے اور چوتھے نے شہر چوانگ چاؤ میں اپنی دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ شہر کنتن (کوانگ چو) میں جو صحابی تھے، ان کا نام وقاص تھا۔ کوانگ چو شہر میں جو چین کی سب سے پہلی مسجد بنی ہے، اس میں یہ کتبہ عربی میں لکھا ہوا آج تک موجود ہے: "هذا أول مسجد في الصين بناه سيدنا وقاص رضي الله عنه"۔ یہ چین کی سب سے پہلی مسجد ہے جس کی تعمیر وقاص نے کروائی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شہر کنتن میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں ان کا مقبرہ بھی ہے۔ شہر کنتن کوانگ ٹانگ صوبہ میں ہے، جو ہانگ کانگ کے قریب ہے۔

تانگ خاندان کے بادشاہوں نے چین کے اندر دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے کی انہیں مکمل اجازت دے رکھی تھی۔ بہت سارے عرب مسلمان تاجر بھی سمندری راستے سے چین میں داخل ہوئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان عرب تاجروں نے بھی چین کے اندر اشاعتِ اسلام کے کام کو جاری رکھا۔ چنانچہ ان کی دعوتی کوششوں سے یونان، کوانگ سی، فوکین، کوانگ ٹانگ، چکیانگ، آن ہوئی، کیانگ سی، ہوپے اور ہونان صوبوں میں کثیر تعداد میں چینی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، یہاں تک کہ یونان اور ہوپے ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔

شمال مغربی حصے میں ترک فوجیوں کے آنے کے سلسلے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ چین کے تانگ خاندان کے بادشاہ شیوان چونگ کے زمانے میں ایک جنرل لوشان نے اس کے خلاف بغاوت کر کے دار السلطنت کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران بادشاہ بھاگ گیا۔ امراء و وزراء نے جب دیکھا کہ بادشاہ محل چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو انہوں نے شہزادے اور ولی عہد شیو چونگ کو بادشاہ بنا لیا اور اس سے درخواست کی کہ ایک تیز رفتار قاصد خراسان کو روانہ کیا جائے اور وہاں کے مسلم حکام سے فوجی مدد مانگی جائے۔ چنانچہ فوراً ایک خاص نمائندے کے ذریعے امیر خراسان کو پیغام بھیجا گیا۔ دو مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مسلم فوج آ گئی، جو دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ چین کے پایۂ تخت کے قریب پہنچتے ہی وہ باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور سخت جنگ کے بعد باغیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ بادشاہ شیو چونگ نے جب دیکھا کہ مسلم فوج فتح یاب ہوئی اور باغی جنرل لوشان کی بغاوت ناکامی سے دوچار ہوئی تو اس نے خوش ہو کر ان کو یہ اجازت دے دی کہ یہ مسلمان اپنی مرضی کے مطابق دار السلطنت میں سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور چینی عورتوں سے شادی بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ دس ہزار فوجی مسلمان چین کے شمال مغربی علاقے میں بس گئے اور باقاعدہ چینی فوج میں شامل ہو گئے۔ یہ واقعہ ۷۵۶ء کا ہے، جبکہ خلافت عباسیہ کا دور تھا اور ترکستان کا پورا علاقہ مسلم خلافت کے زیر نگیں آ چکا تھا اور ترکستان کے ترک پورے کے پورے حلقۂ بگوشِ اسلام ہو کر اسلامی فوج کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ دس ہزار فوجی جو چین گئے تھے، وہ سب ترک تھے۔ بادشاہ نے ان کے لیے خاص طور پر ایک دار الضیافہ تعمیر کروایا

اور تمام شہروں میں اعلان کروا دیا کہ وہ مسلمان جنہوں نے جنگ میں اپنی بہادری دکھائی ہے، وہ شاہِ چین کے مہمان ہیں۔ وہ مہمان خانے میں رہیں گے، اس میں ان کے لیے عبادت خانہ بھی ہے جس میں وہ عبادت کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے وطن واپس نہیں گئے بلکہ چینی عورتوں سے شادیاں کر کے وہیں بس گئے۔ اس وقت بغداد میں خلیفۂ عباسی ابوجعفر منصور کی حکومت تھی۔

پھر ۸۴۱ء سے ۸۴۷ء کے درمیان شاہ دو چونگ کے زمانے میں ہزاروں مسلمان ترکستان سے چین منتقل ہوئے اور شاہِ چین سے درخواست کی کہ ان کو اپنی رعایا میں شامل کر لیا جائے۔ شاہِ چین نے ان کی درخواست منظور کر کے گانزو اور شنسی، ان دو صوبوں کو ان کی سکونت کے لیے مقرر کر دیا۔ ان لوگوں نے بھی چینی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔

اس کے بعد ۱۲۱۵ء میں جب چین میں مغلوں کی حکومت قائم ہوئی تو ترکی و تاتاری مسلمان کثرت سے چین پہنچے۔ اس طرح ان کی آبادیاں نینگ شا، بانان، شانسی، شانگ ٹانگ، سوی یوان اور چیلی صوبوں میں پھیل گئیں۔ گانزو، شنسی، جھول اور ننگ شا میں تو وہ اکثریت میں آگئے۔

۱۳۶۹ء سے منگ خاندان کی حکومت شروع ہوئی، جس نے تقریباً ۳۰۰ سال، ۱۶۴۴ء تک چین پر حکومت کی۔ منگ سلطنت کے بانی چو یوان چانگ کے بارے میں کئی محققین کی رائے ہے کہ وہ مسلمان تھا، اس کو چینی مسلمان خلیفہ کہتے تھے۔ اس کی بیوی بھی مسلمان تھی۔ وہ جس محلے میں پیدا ہوا تھا، وہاں صرف مسلمانوں کی آبادی ہے اور وہ سب اپنے نام سے پہلے "چو" لگاتے ہیں۔ چو یوان چانگ کے سارے مشیر، وزراء اور بڑے سپہ سالار سب مسلمان تھے۔ وہ باقاعدہ مسجد جاتا اور نماز بھی ادا کرتا تھا۔ اس نے حکومت حاصل کرنے کے بعد ہی ایک مسجد کی تعمیر کا فرمان جاری کیا تھا۔ اس مسجد کے مکمل ہونے پر اس نے سو چینی کلمات پر مشتمل ایک قصیدہ لکھ کر سنایا تھا، جس میں اسلام، نبیؐ اسلام کی خوب تعریف کی تھی۔ وہ چینی نسل میں سے مسلمان تھا، اس کے جانشین بھی سب مسلمان تھے۔ اس طرح منگ سلطنت کا دور چین میں مسلم حکومت کا دور تھا۔

اس عرصے میں مسلمانوں نے نہ صرف فوجی ملازمتوں میں کافی حصہ لیا، بلکہ تمدنی، عمرانی اور تعلیمی میدانوں میں بھی اپنی لیاقت اور استعداد کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ بادشاہوں کے حکم سے علوم و فنون کی کئی عربی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ منگ میں اسلامی علوم و فنون کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ بادشاہِ وقت بھی ان کے پھیلانے میں حتی الامکان امداد کرتے تھے۔

۱۶۴۴ء میں مانچو خاندان نے چین کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ اس خاندان نے کل ۲۶۷ سال، ۱۹۱۱ء تک چین پر حکومت کی۔ اس خاندان کی حکومت شروع ہوتے ہی چینی مسلمانوں کے لیے ابتلا و آزمائش کا دور شروع ہو گیا۔ ہر طرح کی ذہنی و عملی آزادی ان سے چھین لی گئی، تمام سابقہ عہدوں اور منصبوں سے ان کو محروم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر بے پناہ مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ عربی پڑھنے اور اسلامی تعلیم حاصل کرنے پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا تو بڑے پیمانے پر ان کی گرفتاری عمل میں لائی گئی اور ان کے خلاف بغاوت اور فتنہ انگیزی کے مقدمے قائم کیے گئے۔

دراصل مانچو، جو چین میں اقلیتی حیثیت رکھتے تھے، انہوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی تاکہ مسلمانوں اور چینی ہنوں کے درمیان سخت دشمنی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو دبانے کے لیے چین کی ہن نسل کے سپاہیوں کو استعمال کیا۔ اس طرح سے ہنوں اور مسلمانوں میں دشمنی پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

چینی لوگ مسلمانوں کو "ہوئی چھی" یا "ہوئی ہوئی" کے نام سے پکارتے ہیں، کیونکہ چین کا جو قبیلہ سب سے پہلے مسلمان ہوا، اس کا نام ہوئی چھی تھا۔ اس لیے چینیوں نے ان تمام مسلمانوں کو ہوئی چھی کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ بعد میں مسلمانوں نے ہوئی چھی کو ہوئی ہوئی سے بدل دیا۔ ہوئی ہوئی کے معنی ہیں روحانیت اور مادیت کا جامع۔ اس طرح یہ لفظ مسلمان کے مفہوم کو پورا ادا کرتا ہے۔

چین میں سرکاری طور پر جو گروپ بندی کی گئی ہے، اس کے مطابق چین میں کل ۵۶ سے زائد نسلی گروپوں میں مسلمانوں کی ۱۰ گروپوں کے طور پر درجہ بندی ہوئی ہے، جن میں سے تین مسلمان نسلی گروپوں کی آبادی زیادہ ہے۔

(۱) ہوئی مسلمانوں کو ایک مستقل نسلی گروپ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ نسلاً عرب یا چینی ہیں، جن کی آبادی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ یہ ہوئی مسلمان چین کے ہر شہر اور ہر خطے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ مسلمان بڑے خوش حال ہیں۔ انہوں نے پورے چین میں مسلمان ہوٹلوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ ان مسلمانوں کے مرد سفید ٹوپی اور خواتین اسکارف زیبِ تن کرتی ہیں۔ یہ ہوئی مسلمان ان عربوں کی اولاد ہیں جو جنوب مشرقی سمت سے چین میں داخل ہوئے اور ان چینی ہنوں کی اولاد ہیں جنہوں نے ان عربوں کے ہاتھ میں اسلام قبول کیا۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

فکر وعمل

اخلاق واعمال کا فساد اور اس کے نتائج

مولانا محمد عثمان خان ندوی (انچارج مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء)

اسلام دین فطرت ہے اور زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ بھی، یہ زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی مکمل رہنمائی کرتا ہے، چاہے اجتماعی زندگی ہو یا انفرادی، خرید وفروخت ہو یا سماجی و معاشرتی معاملات، زندگی میں خوشی ہو یا غم کے لمحات، غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اسلام اس کی مکمل رہنمائی نہ کرتا ہو، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان دنیا اور آخرت میں اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ ایک سچا مسلمان بن کر اپنی زندگی کو مکمل طور سے اللہ اور اس کے رسول کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے۔

نبی کریم ﷺ نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی امت کو بہترین اخلاق کی تعلیم دی ہے، آپ ایسے پیشوا اور رہبر تھے جنہیں اللہ رب العزت نے بیک وقت دینی ہدایت، رہنمائی اور اخلاقی تربیت واصلاح کے لیے دنیا میں مبعوث فرمایا تھا، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ۔ اسی بنا پر نبی کریم ﷺ اپنے پیروکاروں کے عقائد کی درستگی کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اعلیٰ کردار کی بہتر سے بہتر درستگی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اگر آپ کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں اپنایا جائے تو آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوگا، اور سبھی رواداری اور ایک دوسرے کی رعایت کا خیال کرتے ہوئے ایک دوسرے کی عزت اور احترام کریں گے، اور بچے ماں باپ کا ادب کریں گے اور بڑا اپنے چھوٹے سے نرمی کا معاملہ کرے گا، اور چھوٹا اپنے بڑے کا ادب و احترام کرے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سب سے کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

اگر اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالیں تو اس وقت مسلمان اپنے دین اسلام کا سچا عملی پیکر تھا، وہ اپنے کردار سے اسلامی سیرت کا داعی تھا اور فطرت کے مطابق بلند اخلاقی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرتا تھا، لیکن آج ہم اپنے اصل مقام سے ہٹ کر اخلاق وکردار کی گراوٹ کی وجہ سے پستی کی طرف گامزن ہیں، موجودہ معاشرہ میں ہماری پہچان اور تصویر ایک ایسے انسان کی ابھر کر سامنے آتی ہے جو ہر خوبی اور ہر اچھے کردار اور اخلاقی قدروں سے عاری ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ کردار سے سارا علاقہ متاثر تھا، جن لوگوں نے آپ ﷺ کے کردار کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ تو فوراً ہی ایمان لے آئے اور ان کے لیے آپ کی نبوت کا اعتراف گویا ایک حقیقتِ منتظر کا اعتراف تھا، انہیں دعوت قبول کرنے کے لیے کسی بھی دلیل کی ضرورت نہیں تھی، چونکہ دلیل خود آپ ﷺ کا اعلیٰ کردار تھا۔ جنہوں نے آپ کو ذرا دور سے بھی دیکھا تھا، وہ بھی آپ کی دیانت داری، امانت، شرافت اور صداقت کے معترف تھے۔ خود کفارِ مکہ آپ کو امین کہتے تھے۔

تربیت وتنظیم افراد

اسلامی انقلاب کی تبلیغ کی حقیقی بنیاد قولِ صالح سے زیادہ عملِ صالح پر قائم ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا عملی نمونہ اپنے کردار سے پیش کیا، اور جب اسلام عرب کی سرزمین سے نکل کر باہر کی دنیا میں پھیلا تو لوگ مسلمانوں کے کردار اور ان کے اخلاقِ حسنہ دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے معترف ہوتے چلے گئے، پہلے وہ مسلمانوں کو دیکھ کر ان کے عمل و اخلاق سے مرعوب ہوتے، پھر اسلام سے متاثر ہوتے، بالآخر اسلام ہی کو اس اخلاق کا حقیقی سبب سمجھتے اور اسے محبوب ومطلوب جان کر اس کے معتقد ہوجاتے، اور اس کی بنیادی تعلیم معلوم کرکے اس کے دائرے میں داخل ہوجاتے۔

آج ہمارے معاشرہ میں جہاں کہیں بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل موجود ہیں، وہیں بڑھتا ہوا اخلاقی انحطاط بھی بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ جنسی و اخلاقی جرائم مغربی دنیا کے لیے تو کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر مسلم معاشرے میں ان مکروہ اعمال کی وجہ سے معاشرتی تنزلی عیاں ہے، جدیدیت کی مصنوعی دنیا میں کسی اخلاقی ضابطے کی پابندی کے بغیر اسمارٹ فون، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا آج کے دور میں وہ تباہی مچا رہے ہیں جس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو پورے ملک کا اخلاقی وسماجی مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا، اس لیے ہمیں اس کے لیے سب سے پہلے اخلاقیات کی تربیت اپنے گھر سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی سرگرمیوں اور ان کے دوستوں پر نظر رکھنے کی

سخت ضرورت ہے، خدانخواستہ کہیں وہ ناسمجھی میں غلط لوگوں کے ساتھ تو شامل نہیں ہیں۔ بچے اگر بگڑ جائیں تو پورے گھر اور تمام معاشرہ کی امیدوں اور ارمانوں کا خون کردیتے ہیں۔

آج کے دور میں اخلاق باختہ لٹریچر کا شمار ایسے عوامل میں ہے، جو بے راہ روی کو جنم دے رہے ہیں، تاہم موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولیات آج کے دور میں جہاں ایک طرف بہترین رابطے کا ذریعہ ہیں، تو دوسری طرف ان کے معاشرہ پر پڑنے والے مضر اثرات بھی نمایاں ہیں، عام تاثر یہی ہے کہ آج کی یہ جدید ٹیکنالوجی ہماری نوجوان نسل کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچارہی ہے۔

سورۂ لقمان میں تربیت اولاد کے سلسلہ میں بہت ہی مؤثر انداز میں نصیحتیں ذکر کی گئی ہیں، جن میں بچوں کی ذہنی، فکری وخیالی، معاشرتی و سماجی اور اصلاحی و تہذیبی تربیت میں شاندار دستور العمل ہیں اور والدین کے لیے اولاد کی تربیت کے معاملہ میں ان نصیحتوں کو اساس و بنیاد کا درجہ دیا گیا ہے، جن میں وحدانیت کے عقیدہ کو بچوں کے ذہنوں میں راسخ کرنا، اللہ کی ذات وصفات میں دوسروں کو شریک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اوران کا احترام کرنا، ہر طرح کی چھوٹی بڑی برائی سے بچنے کی ان کو ترغیب دینا، ان کو نماز پڑھنے کی تاکید کرنا، اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے کی تدابیر کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

اگر آج ہم مسلم معاشرہ پر نظر ڈالیں تو لوگوں کو ہر طرح کی برائیوں میں مبتلا پائیں گے، مکاری، جعل سازی، دھوکا بازی، شراب نوشی جیسی مہلک بیماریوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، دراصل یہ بگاڑ اور فساد دل و دماغ کے فساد سے ہی پیدا ہوتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اس کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے:

أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔

(خبردار! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ درست اور ٹھیک رہتا ہے تو پورا جسم درست اور ٹھیک رہتا ہے اور وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام ہی بگڑ جاتا ہے، اور سن لو! وہ دل ہے)۔

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن صاحب ندوی اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: ''درحقیقت دل ہی انسان کے افکار وخیالات کا سرچشمہ ہے، وہی صلاح وفساد، نیکی کا حکم دینے، اور بدی اور برائی سے روکنے اور محبت وعداوت کے اظہار کا مرکز ہے، اس کی طہارت کا خیال رکھنا اور اس کو اطمینان وسکون بہم پہنچانا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے (أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ)

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کے لیے جو چیزیں بھی پیدا کی گئی ہیں، وہ اپنے معمول کے مطابق مسخر ہیں، اور ہزاروں برس ہا برس سے آگ میں جلانے کی، پانی میں بجھانے کی، اور غذا کو قوت پہنچانے کی، دوا کو شفا دینے کی صلاحیت جو اللہ تعالیٰ نے ان میں رکھی ہیں، بحکم الٰہی اپنے اندر اثر رکھتی ہیں، اسی طرح انسان کے اچھے برے اعمال اور قوموں وافراد کی اخلاقی زندگی میں اثر رکھتے ہیں، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان اعمال و اخلاق کا کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم کو سابقہ قوموں کے قصوں سے معلوم ہوتا ہے۔

قوم ہود کا واقعہ ہو، یا قوم لوط کا، یا دیگر اقوام کے واقعات اور ان پر آنے والے عذاب کے اسباب، ان کے اعمال و اخلاق کے فقدان اور گراوٹ کا نتیجہ ہی تھا، ان واقعات سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ہمارے اعمال واخلاق کا کیا طرزِ عمل ہے، آج ہم اپنے اعمال واخلاق کو بہتر بنانے کے لیے کتنے کوشاں اور فکر مند رہتے ہیں؟ اور ساتھ ہی اپنے اہل وعیال اور اپنی قوم وملت کے لیے کتنے فکر مند ہیں!

حوادث اور مسائل کا پیش آنا، اعمال اور اخلاق کے فساد سے وابستہ ہوتے ہیں، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾۔

(خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہوگیا ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمائے ہیں)۔

آج ہمارے اعمال و اخلاق سے ہمارے دل اتنے سخت ہو چکے ہیں کہ ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ پیش آنے والے واقعات ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں جو ہم سے دن رات صادر ہوتے ہیں، یا خدا کا عذاب۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اعمال واخلاق کو درست کریں، اور اعمالِ صالحہ کے داعی، سیئات کے منکر بنیں۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾۔

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

☆☆☆

یقینِ محکم

حالات کی گردش اور تجدیدِ عزم

مولانا محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی

ہر دور میں کچھ ایسے نازک اور فیصلہ کن لمحات آتے ہیں جب حالات کی تاریکی انسان کی نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ اسے روشنی کا مستقبل بھی تاریک دکھائی دینے لگتا ہے۔ ظلم اپنی قوت کے نشے میں بے لگام ہوتا ہے، باطل اپنے وسائل و اقتدار کے بل پر ناقابلِ شکست نظر آتا ہے، حق کے علم بردار بظاہر کمزور، منتشر اور بے سروسامان دکھائی دیتے ہیں اور شکست خوردہ ذہن یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید اب واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ غروب ہمیشہ اختتام نہیں ہوتا، بسا اوقات وہ ایک نئے طلوع کا مقدمہ ہوتا ہے۔

سورج جب ایک افق سے غروب ہوتا ہے تو اس کی روشنی ختم نہیں ہوتی، وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو کر کسی دوسرے افق پر طلوع ہونے کے لیے اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ اہل ایمان کی تاریخ بھی اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ ان کے سفر میں شکست کے مرحلے آئے، ہجرتیں ہوئیں، سلطنتیں اٹھیں اور گریں، شہر اجڑے اور تہذیبی مراکز تباہ ہوئے، لیکن ایمان کا چراغ روشن رہا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔ ایک نسل نے قربانی دی تو دوسری نسل نے اس قربانی کو بنیاد بنا کر نئی تعمیر کی۔ ایک خطے میں سیاسی قوت کمزور ہوئی تو دوسرے خطے میں نئی صبح طلوع ہوئی۔

اسی حقیقت کو شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے ایک ایسے شعر میں سمیٹ دیا ہے جو امت مسلمہ کی پوری تاریخ کا استعارہ بن گیا:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

اس شعر میں تاریخ کا ایک گہرا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اہلِ ایمان کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کبھی شکست نہیں ہوتی، ان پر کبھی آزمائش نہیں آتی یا ان کے راستے میں کبھی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کسی ایک زمانے، خطے یا سیاسی اقتدار سے مرعوب نہیں ہوتی۔ ان کی اصل قوت ایمان، یقین، دعوت، علم اور کردار میں ہوتی ہے، اسی لیے ایک دور کا زوال ان کے پورے سفر کا اختتام نہیں بن جاتا۔

قرآنِ کریم نے اہلِ ایمان کو اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آلِ عمران: ۱۳۹)۔

”اور کمزور نہ پڑو اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم (پختہ) ایمان والے ہو۔“

یہ آیت ایسے وقت میں نازل ہوئی جب مسلمانوں کو اُحد کے میدان میں ایک سخت آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ اس لیے اس کا پیغام محض خوش فہمی یا جذباتی تسلی نہیں، بلکہ شکست کے بعد اٹھ کھڑے ہونے کا قرآنی اصول ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ تم پر کبھی شکست نہیں آئے گی، بلکہ یہ بتایا کہ ایک وقتی شکست تمہاری منزل کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ایمان رکھنے والی قوم کے لیے اصل سوال یہ ہے کہ وہ آزمائش کے بعد اپنے آپ کو کس طرح سنبھالتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اس کی روشن مثال ہے۔ مکہ مکرمہ میں اہلِ ایمان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ انہیں ستایا گیا، معاشرتی مقاطعہ کیا گیا، ان کے لیے زمین تنگ کر دی گئی اور بالآخر انہیں اپنے وطن سے ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ بظاہر تو یہ ایک شکست خوردہ جماعت کا منظر تھا، لیکن یہی ہجرت ایک نئے مرحلے کا آغاز بنی۔ مدینہ منورہ میں ایمان، اخوت، عدل اور اجتماعی نظم کی بنیاد پر ایک ایسی اسلامی معاشرت وجود میں آئی جس نے نہ صرف عرب کے حالات بدل دیے بلکہ تاریخ انسانی کا رخ موڑ دیا۔ پھر وہی لوگ جنہیں مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا گیا تھا، ایک دن فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔

یہ ”اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے“ کی مثال ہے۔

اسلامی تاریخ آگے بڑھی تو آزمائشوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی نے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا۔ بغداد صرف علم، تہذیب، تحقیق اور علمی سرگرمیوں کا ایک عظیم مرکز تھا۔ اس کی تباہی کو دیکھ کر بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسلامی تہذیب کا چراغ بجھ گیا، لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ تہذیبیں صرف عمارتوں میں نہیں رہتیں۔ بغداد کا سورج غروب ہوا تو اسلامی دنیا کے دوسرے خطوں میں علمی و سیاسی قوتیں ابھرتی رہیں۔ پھر عین جالوت کے میدان میں مسلمانوں نے تاتاری قوت کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ تاریخ میں کوئی طاقت ہمیشہ کے لیے ناقابلِ شکست نہیں ہوتی۔

اندلس کی داستان اس حقیقت کی ایک اور دردناک مگر سبق آموز مثال ہے۔ ایک زمانے

میں اندلس علم، تہذیب، فلسفہ، طب، ادب اور فنون کا مرکز تھا۔ پھر حالات بدلے، سیاسی کمزوری بڑھی اور بالآخر غرناطہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن اندلس کی علمی وراثت اس کے ساتھ دفن نہیں ہوئی، بلکہ اس کے علوم، افکار اور علمی اثرات یورپ اور اسلامی دنیا کے دوسرے مراکز تک پہنچے۔ ایک زمین کا سیاسی غروب انسانی علم کے مکمل غروب کا سبب نہیں بن سکا۔

بیت المقدس کی تاریخ بھی یہی سبق دیتی ہے۔ صلیبی قبضے کے ایک طویل دور کے بعد صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کیا۔ یہ صرف شہر کی بازیابی نہیں تھی، اس میں یہ سبق بھی تھا کہ جب ایمان، مقصد، قیادت، نظم اور قربانی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو حالات کی سختی دائمی رکاوٹ نہیں رہتی۔

برصغیر کی تاریخ میں بھی یہی منظر پیش آتا رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت کو شدید نقصان پہنچا۔ اقتدار چھن گیا، معاشرتی حالات بدل گئے اور ایک پوری نسل نے شکست اور بے بسی کا تجربہ کیا۔ لیکن اس دور میں بھی اسلام کی بقا کے لیے علماء امت نے تعلیم، دینی علوم، اصلاح اور فکری تربیت کے نئے مراکز قائم کیے۔ ان علمی و دینی اداروں نے بدلتے ہوئے حالات میں نئی نسل کی دینی وفکری تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

مسلمان صرف اقتدار سے زندہ نہیں رہتے، بلکہ اپنے ایمان، علم، تہذیب، کردار اور فکری شعور سے زندہ رہتے ہیں۔ اقتدار چھن سکتا ہے، جغرافیہ بدل سکتا ہے، سیاسی نقشے تبدیل ہو سکتے ہیں، لیکن اگر ان کے پاس زندہ فکر اور مضبوط کردار باقی ہے تو دوبارہ اٹھنے کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔

آج امت مسلمہ پھر ایک ایسے ہی دور سے گزر رہی ہے جس میں کئی طرح کے چیلنجز بیک وقت درپیش ہیں۔ فلسطین، خصوصاً غزہ کے حالات نے انسانی ضمیر کے سامنے ظلم، طاقت اور انصاف کے بنیادی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، تہذیبی اور فکری سطح پر مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ کہیں انتشار ہے، کہیں کمزوری، کہیں باہمی اختلاف، کہیں فکری مرعوبیت اور کہیں ماضی کے کارناموں پر غیر ضروری اطمینان۔

لیکن ایسے حالات میں صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ ایک دن حالات بدل جائیں گے۔ سورج صرف اس لیے دوبارہ طلوع نہیں ہوتا کہ وہ پہلے طلوع ہوا تھا، اہلِ ایمان کی تاریخ میں بھی ہر نئی صبح کے پیچھے قربانی، جدوجہد، کردار، تنظیم اور اللہ پر توکل کی ایک طویل داستان ہوتی ہے۔

اس لیے آج امت کے سامنے اصل سوال یہ نہیں کہ حالات کتنے خراب ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم خود کتنے مضبوط ہیں، ہمارا ایمان کتنا زندہ ہے، قرآن سے ہمارا تعلق کتنا گہرا ہے، سنت ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس حد تک موجود ہے، علم وتحقیق میں ہمارا مقام کیا ہے، ہماری نئی نسل کس فکری سمت میں آگے بڑھ رہی ہے، اور کیا ہم باہمی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اپنی اجتماعی ذمہ داری کو محسوس کرنے کے لیے تیار ہیں؟

اگر ہم صرف اپنے اسلاف کے کارنامے گنواتے رہیں اور اپنے دور میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہ کریں تو ماضی کی عظمت ہمارے مستقبل کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ تاریخ کا احترام ضروری ہے، لیکن تاریخ پر تکیہ کر کے زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ ہر نسل کو اپنے عہد کا امتحان خود دینا پڑتا ہے اور اپنے زمانے کی ضرورتوں کا جواب خود پیدا کرنا پڑتا ہے۔

آج ہمیں ایسے ایمان کی ضرورت ہے جو صرف جذبات میں نہیں، کردار میں نظر آئے، ایسے علم کی ضرورت ہے جو صرف معلومات کا ذخیرہ نہ ہو بلکہ مسائل کے حل کی صلاحیت پیدا کرے، ایسی دینداری کی ضرورت ہے جو انسان کو زمانے سے کاٹنے کے بجائے اسے زمانے کی رہنمائی کے قابل بنائے، اور ایسی بصیرت کی ضرورت ہے جو اختلاف کو دشمنی نہ بننے دے اور تنوع کو انتشار میں تبدیل نہ ہونے دے۔

قرآن وسنت سے مضبوط تعلق، معیاری تعلیم، علمی تحقیق، اخلاقی تربیت، اجتماعی نظم، باہمی اتحاد اور تعمیری فکر وہ بنیادیں ہیں جن پر کسی بھی نئی صبح کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ محض ماضی کا فخر مستقبل نہیں بناتا، مستقبل وہی قومیں بناتی ہیں جو اپنے ماضی سے سبق لے کر اپنے حال کی اصلاح اور اپنے مستقبل کی تعمیر کرتی ہیں۔

اس لیے موجودہ حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار ہونا اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ مایوسی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نگاہ صرف حالات پر ہو اور اللہ کی سنتوں، تاریخ کے تجربات اور اپنی داخلی قوتوں پر نہ ہو۔ اہلِ ایمان کی نگاہ حالات سے آگے منزل پر ہوتی ہے۔ وہ اندھیرے کو دیکھتے ضرور ہیں، مگر اندھیرے کو آخری حقیقت نہیں سمجھتے۔

ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ ''خورشید'' بننے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہر میدان میں فوراً غالب ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہ روشنی پیدا کریں جس سے دوسروں کو بھی راستہ ملے۔ ایک عالم اپنے علم سے، ایک استاد اپنی تربیت سے، ایک قلم کار اپنی فکر سے، ایک تاجر اپنی دیانت سے---

(باقی صفحہ ۲۵ر پر)

عمل پیہم

نوجوان: ملت اسلامیہ کا اہم ترین سرمایہ

مولانا محمد زین الحق ندوی (شعبۂ دعوت وارشاد، ندوۃ العلماء)

نوجوان (Gen-Z) یہ لفظ آج کا ایک ٹرینڈنگ ٹرم (Trending Term) ہے، ہر عام اور خاص محفل میں اس اصطلاح پر گفتگو ہو رہی ہے، الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، دوستوں کی محفل، یہاں تک کہ گھروں میں بھی جین زی پر بہت گفتگو ہو رہی ہے، کہ یہ بہت حساس نسل ہے، یہ بہت سوالات کرنے والی نسل ہے، یہ روایات کو چیلنج کر رہی ہے، یہ بڑوں کی بات کم مانتی ہے، ڈیجیٹل ورلڈ میں یہ بہت منہمک رہتی ہے، اس لیے معاشرے کی ایک تعداد جین زی کو ایک چیلنج سمجھ رہی ہے۔

جین زی کیا ہے؟ یہ ایک نفسیاتی صفت (Trends Psychology) نہیں ہے، یہ ایک مخصوص نسل کی شناخت (Generational Label) ہے، یہ ایک زمانی لقب ہے، جو بچے ۱۹۹۷ء سے ۲۰۱۲ء کے درمیان پیدا ہوئے، انہیں جین زی کہا جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان جو جین زی ہے، ان میں دو خوبیوں کا امتزاج پایا جاتا ہے، وہ جین زی بھی ہے، وہ نوجوان بھی ہے۔ چند سال پہلے جب یہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تو جین زی تھے، نوجوان نہیں تھے، آئندہ بیس سال کے بعد جب یہ بڑھاپے کی چوکھٹ پر قدم رکھیں گے تب بھی یہ جین زی رہیں گے، لیکن جوانی باقی نہیں رہے گی، وہ جو ہیجانی اثر (Bubbling Effect) ہے، وہ باقی نہیں رہے گا، اس وقت ہمارے گھروں میں جو نسل پرورش پا رہی ہے، اگر ان کی عمر ۱۶ سال سے ۳۰ سال ہے تو ہم انہیں جین زی کہتے ہیں۔

ہر انسان اپنی زندگی میں فطری طور پر بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کے مراحل سے گزر کر بڑھاپے کو پہنچتا ہے، اللہ کی جانب سے ملی ہوئی مدتِ زیست کو مکمل کر کے بحکم خداوندی اس دنیا سے عالمِ برزخ کے لیے منتقل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلہ کی کچھ خاصیت ہوتی ہے، کچھ کر گزرنے کا جذبہ، جوش، امنگ اور حوصلہ نوجوانی کی عمر میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے، اسی بات کو شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

تاریخ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انقلابی امور سب سے زیادہ اسی عہدِ شباب میں انجام پائے، ملک وملت کے لیے، انسانیت کے لیے اسی مرحلہ میں سب سے زیادہ کام کیے گئے۔ واضح رہے کہ ہر دور کے نوجوانوں میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں، اور اس زمانہ کے نوجوانوں میں بھی خوبیاں ہیں، بہت تیزی سے سیکھتے ہیں، گلوبلائزیشن کے اس دور میں ان کی دنیا سے واقفیت بہت تیز ہے، عرف کی لینگویج بن چکی انگریزی زبان جاننے کے سبب ہر خبر کو جلد معلوم کر لیتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ ہر زمانے کے نوجوانوں کے کچھ مسائل (Problems) ہوا کرتے ہیں، جیسے ان کی بڑھی ہوئی جذباتیت، تجربات کی کمی وغیرہ، آج جین زی کے اندر یہ اور اس جیسے دیگر ایشوز ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں قرآن کیا سکھاتا ہے؟ کیا ان ایشوز پر ہم فوکس کریں؟ کیا نئی نسل کی صرف خامیوں پر نگاہ رکھیں؟ ہماری نگاہ کہاں ہو؟

قرآنِ کریم ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ نوجوان نسل کی خوبیوں پر ہماری نگاہ ہو، ان کی نفسیات کو سمجھیں، ان کی خوابیدہ صلاحیت کو پہچانیں، ان کی صحیح رخ پر رہنمائی کریں۔ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی صحیح تربیت کریں، اور انہیں دین و ملت کا خادم بنائیں۔ قرآنِ کریم میں ہمیں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ملتا ہے، وہ نوجوان تھے، سلیم الفطرت نوجوان تھے، نوجوانوں کی جو خوبیاں اور جذبات ہوتے ہیں وہ ان کے اندر موجود تھے، وہ سوالات کرتے تھے، حقیقت تک پہنچنے کے آرزومند تھے، سماج سے پوچھتے تھے، کہ یہ بت کیسے تمہارے خدا ہو سکتے ہیں؟ یہ جو بت بنا کر تم نے رکھے ہیں کیا یہ سنتے ہیں؟ کیا یہ بولتے ہیں؟ کیا تمہاری دعاؤں کو سن سکتے ہیں؟

ہر زمانہ کا نوجوان سوالات کرتا رہا ہے، اس زمانہ کا نوجوان بھی سوالات کر رہا ہے، اگر ہمارے بچے صحیح سوالات کر رہے ہیں تو بہت اچھا، ہمیں خوش ہونا چاہیے، صحیح جواب ہمیں معلوم ہے تو بتائیں، ورنہ تو کہیں کہ ان سوالات سے متعلق فلاں صاحب سے رجوع کریں۔ اور اگر بروقت یہ صحیح رہنمائی نہیں کی گئی تو وہ لازماً الیکٹرانک میڈیا سے سوال حل کرے گا، اور پھر اس کے بعد بچنے سے زیادہ بھٹکنے کے امکان ہیں۔

قرآنی اسوہ: قرآنِ کریم میں مذکور انبیائے کرامؑ کے سنِ شعور اور عہدِ شباب کے واقعات ہمارے

لیے مشعلِ راہ ہیں، حضرت ابراہیمؑ کا مشرکین سے سوالات کرنے اور دعوتِ توحید پیش کرنے کا واقعہ، حضرت یوسفؑ کا بھائیوں کے حسد پر صبر کرنا اور مصر کے محل میں شدید تقاضے کے باوجود اپنے نفس پر قابو رکھنا، حضرت اسماعیلؑ کا حکم کی تعمیل میں اپنی جاں نثار کرنا، اور حضرت موسیٰؑ کا مدین پہنچتے ہی خدمتِ انسانیت کا واقعہ، اصحابِ کہف کا واقعہ اور حضرت لقمانؑ کا مشفقانہ و منطقیانہ اسلوب میں اپنے بیٹوں کو نصیحت کرنے کا واقعہ، عہدِ شباب کی تربیت کے لیے ایک شاہکار نمونہ ہے۔

نبوی اسوہ: عہدِ نبوی ﷺ کے نوجوانوں نے علوم وفنون کی نشر و اشاعت میں، اسلام کی دعوت وتبلیغ میں، دینِ حق کی سربلندی میں، ملکی سلامتی کے قیام میں، کسبِ معاش میں، خدمتِ خلق میں، انفاق فی سبیل اللہ میں جو کردار ادا کیا ہے، کتبِ احادیث اور سیرت وتاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس سے ناآشنا نہیں ہوں گے۔

نوجوان صحابۂ کرامؓ نے ہر شعبہ میں نہایت اہم کردار ادا کیا، ہر دور کے نوجوانوں کے لیے بہترین اسوہ اور نمونہ چھوڑا، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت ارقمؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت سلمہ بن اکوعؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ وغیرہم اسمائے کرام کی ایک طویل فہرست ہے۔

سننا اور دلائل کے ساتھ اصلاح کرنا: جب نوجوان اپنی بات یا شک وشبہ کا اظہار کرتے یا بے تکلفی میں ناشائستہ سوال کرتے تو انہیں بذریعۂ رعب خاموش کرانے کے بجائے ہمارے نبی ﷺ ان کی پوری بات سنتے اور اس کی مناسب حال اصلاح فرماتے۔ مثلاً ایک نوجوان نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر گناہ کی اجازت طلب کی تھی، لیکن آپؐ نے اس کی بات پر غصہ نہیں کیا بلکہ اس کی نفسیات کے مطابق معقول سوالات و جوابات سے اس کا ذہن بدلا اور اس کو برائی سے روکا اور آخر میں اس کے لیے دعا فرمائی۔

صلاحیتوں کا اعتراف اور اعتماد: نبی کریم ﷺ نے نوعمر صحابہؓ کو ان کی استعداد اور ذوق کے مطابق بڑی بڑی ذمہ داریاں دیں تاکہ ان میں قیادت اور خود اعتمادی کی صلاحیتیں ابھر سکیں، ایک موقع پر آپؐ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو محض اٹھارہ برس کی عمر میں ایک عظیم لشکر کا سپہ سالار بنایا، اسی طرح چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ اولوالعزم نوجوان افراد سے پُر ہے، مثلاً محمد بن قاسمؒ، محمد الفاتح، اورنگ زیبؒ وغیرہم۔

موجودہ صورتِ حال: ماہرینِ نفسیات کا تجزیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ اس جین زی کے اندر نمایاں طور پر دو خوبیاں عموماً پائی جاتی ہیں۔

(۱) سیکھنے کی اہلیت (Ability to Learn)
نئی نئی چیزیں یہ سیکھتے رہتے ہیں، آج ڈیجیٹل پلیٹ فارم سے سیکھنا ان کے لیے آسان اور سہل ہو چکا ہے، بے شمار صلاحیتیں (Skills) اور زبانیں (Languages) وغیرہ سیکھتے ہیں، سیکھنے کا بہترین جذبہ ان کے اندر پایا جاتا ہے، فی الواقع اگر ہم اس خوبی پر نگاہ رکھیں، ان کے ذوق وطبیعت کے مطابق صحیح رہنمائی کریں تو ان کی صلاحیت سے ملت کو خوب فائدہ پہنچے گا۔

(۲) درستگی کی اہلیت (Ability to Change) سائنٹیفک ماحول میں پروان چڑھی یہ نسل کسی بھی حکم کا پہلے منطقی جواب طلب کرتی ہے، جب ان کے سامنے دلیل آجاتی ہے، کام کے فوائد معلوم ہو جاتے ہیں تو فوراً بات قبول کر لیتے ہیں، اور پھر صرف وہ خود ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی درست (Change) کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن اگر بات سمجھ میں نہیں آئی تو آپ خواہ کتنا ناراضی کا اظہار کریں، یہ نسل بات نہیں مانتی ہے اور اگر تنقیدی (Criticism) اسلوب اختیار کیا تو یہ نسل اور زیادہ ضدی ہو جاتی ہے۔

جین زی میں بھی کچھ کمیاں پائی جاتی ہیں، اور یہ کمیاں ہر زمانہ کی نئی نسل میں کم وبیش رہی ہیں، عموماً چار خامیاں اس نسل میں پائی جا رہی ہیں، اور یہ ایسی خامیاں ہیں جن پر تھوڑی سی توجہ دے کر درست کیا جا سکتا ہے۔

(۱) بے مقصدیت (Purposeless) اکثر و بیشتر اس نسل کی نگاہوں سے زندگی کا اعلیٰ مقصد محو ہے، اس لیے ایک بڑی تعداد موبائل اسکرولنگ (Mobile Scrolling) کرتی رہتی ہے، کوئی بڑی امنگ، کوئی بڑا حوصلہ نہیں ہوتا، کثرت سے ریل (Short Reels) دیکھنے کے سبب ان کے سامنے بہت سے ماڈل ہیں، اور اب وہ کنفیوز ہیں کہ وہ کیا کریں، کنفیوژن سے نکالنا، مشفقانہ اسلوب میں ان کے ذوق واستعداد کے مطابق صحیح رہنمائی کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

(۲) غیر ضروری اور غیر مرتب معلومات (Information Overload) بہت زیادہ ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی آدمی صرف انفارمیشن سے کامیاب نہیں ہوتا اور نہ کوئی مفید بنتا ہے، فنی معلومات ہونی چاہیے، حکمت پائی جانی چاہیے، لہٰذا اس نسل کی کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے کہ انفارمیشن کے لوڈ کو کم کریں، نیک دوستوں کی محفل میں بیٹھیں، مقصدیت پر گفتگو کریں۔

(۳) موازنہ (Comparison) کا جو مزاج ہے وہ بہت بڑھا ہوا ہے، کوئی دولت مند، کوئی صحت مند، کوئی عمدہ لباس میں اور کوئی عمدہ گاڑی میں نظر آ گیا تو بس فوراً موازنہ کرنا شروع کر دیا، جس کے سبب پہلے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں، پھر جائز و ناجائز طریقے سے مطلوبہ چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ کیا کیا قدم نہیں اٹھاتے۔

(۴) سماجی زندگی سے لاتعلقی: اس نسل کے اندر سوشل میڈیا سے وابستگی (Digital Activity) بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، روحانیت (Spirituality) بہت کم ہوتی جا رہی ہے، نتیجتاً یہ نسل جتنی محدود زندگی میں جی رہی ہے اتنا ہی وہ دنیا کو محدود سمجھ رہی ہے، حالاں کہ جب سماج سے ہم آہنگ ہوں گے تبھی حقیقتِ حال سے صحیح واقفیت ہوگی۔

مسئلہ کا حل: جین زی کے اندر پائی جانے والی مذکورہ خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت کے بعد اس کی اصلاح کی تدابیر، اس کی افادیت و نافعیت کے طریقوں کا صحیح ادراک کیا جا سکتا ہے، اور ملی تقاضوں کے لیے اس کی صلاحیتوں کو مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ انہیں میں سے کوئی آگے بڑھے اور ملتِ ہندیہ کی سأۃِ ثانیہ کا سبب بن جائے۔

لہٰذا جین زی کی تعلیم، تربیت اور کاؤنسلنگ کی ذمہ داری بالخصوص جن افراد پر ہے وہ والدین (Parents)، اساتذہ (Teachers) اور مربی و رہنما (Mentors) ہیں، جتنا صحیح جین زی کی نفسیات کو سمجھ کر ان کی تربیت اور رہنمائی کی جائے گی، اتنا ہی ملک وملت کے لیے یہ نسل موثر ثابت ہوگی۔ بس درج ذیل چار نکاتی کاوشوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

(الف) تعلق مع اللہ: ایسی ذہن سازی کی جائے کہ اس نسل کا تعلق اللہ سے مضبوط ہو، نماز کی پابندی کے ذریعے، عملِ صالح کے ذریعے، اور کثرتِ استغفار کے ذریعے۔

(ب) صحبت صالح: یہ زمانہ اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوا ہے، ہاں کم ضرور ہیں، بس صالح و نافع افراد سے جوڑ دیں تو ان کی صلاحیتیں موثر و مفید ہوں گی۔

(ج) بتدریج رہنمائی: ڈیجیٹل زمانہ میں پروان چڑھی اس نسل کو بتدریج سوشل میڈیا سے ہٹا کر مفید کاموں میں مصروف کریں، ان کی صلاحیت کو صحیح میدانِ عمل فراہم کریں، ان کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے کاموں پر حوصلہ افزائی کریں۔

(د) تربیتی نشست: تعلیمی اداروں میں ماہانہ یا سہ ماہی نشست برائے والدین (Parents) ضرور منعقد کی جائے، جس میں عظیم نعمتِ خداوندی ''اولاد'' کی صحیح تربیت کے اصول و آداب سے واقف کرایا جائے، عدمِ تربیت کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے، تاکہ کوئی بھی والدین بے شعوری میں بھی صحیح تربیت سے غافل نہ رہنے پائیں۔

بلاشبہ یہ نسل ملت کا عظیم سرمایہ ہے، معاشرتی بہتری، علمی ترقی، اور قومی فلاح کا یہ اہم ستون ہے، ان کی صلاحیت کو مثبت رخ دینا اور ان کو ملک وملت کی قیادت کے لیے تیار کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، لہٰذا مذکورہ خطوط پر سنجیدہ کوشش کی جائے تو ان شاء اللہ بہت جلد مثبت نتائج نظر آئیں گے اور یہ نسل بے راہ روی سے بچ کر آئندہ نسل کی صحیح تربیت کرنے والی بنے گی۔

☆☆☆

بقیہ: حالات کی گردش اور تجدید عزم

ایک نوجوان اپنی صلاحیت اور کردار سے اور ایک عام مسلمان اپنے اخلاق سے اپنے زمانے میں روشنی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہی اجتماعی روشنی نئی صبح کی بنیاد بنتی ہے۔

تاریخ ہمیں یہ امید ضرور دلاتی ہے کہ غروب کے بعد طلوع ممکن ہے، لیکن وہ ہمیں یہ اجازت نہیں دیتی کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر طلوع کا انتظار کرتے رہیں۔ سورج اپنے مقررہ نظام کے ساتھ سفر کرتا ہے، اہلِ ایمان کو بھی اپنے حصے کا سفر طے کرنا ہوگا۔ دعا بھی کرنی ہوگی، تدبیر بھی، توکل بھی رکھنا ہوگا، جدوجہد بھی، ماضی سے روشنی بھی لینی ہوگی اور مستقبل کے لیے نئے راستے بھی تلاش کرنے ہوں گے۔

یہی اس شعر کا پیغام ہے کہ اہلِ ایمان کی زندگی کسی ایک مقام پر ٹھہر جانے کا نام نہیں۔ وہ آزمائشوں سے گزرتے ہیں، اپنی کمزوریوں سے لڑتے ہیں، کبھی پیچھے ہٹتے ہیں، کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی ایک میدان میں شکست کھاتے ہیں اور کبھی دوسرے میدان میں نئی قوت کے ساتھ ابھر آتے ہیں۔ ان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ شکست کو اپنی آخری شناخت نہیں بننے دیتے۔

سورج کا ایک افق سے غروب ہونا سورج کی موت نہیں ہوتا۔ اسی طرح اہلِ ایمان کا کسی خطے، دور یا میدان میں کمزور ہو جانا ان کے تاریخی سفر کا خاتمہ نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ ایمان زندہ رہے، فکر بیدار رہے، کردار سلامت رہے اور جدوجہد کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔

اور جب یہ سب باقی رہتا ہے تو تاریخ ایک بار پھر اپنے قدیم اصول کی گواہی دیتی ہے کہ:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

☆☆☆

دین وملت

ذرائع ابلاغ میں بیانیہ کی اہمیت اور جوابی بیانیہ کی حکمت عملی

مولانا منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

گزشتہ دنوں ایک معروف ملی ادارہ کی ایک پریس کانفرنس میں ایک خاتون صحافی نے یہ سوال اٹھایا کہ ''ہم اس ملک میں شریعت کو نافذ نہیں کرنے دیں گے''، کیا اس طرح کی باتیں مسلمانوں کے بارے میں ایک خاص بیانیہ (Narrative) قائم کرنے کی کوشش ہیں؟

بظاہر یہ ایک سوال تھا، لیکن اگر اس کے الفاظ اور پس منظر پر غور کیا جائے تو اس کے اندر ایک خاص تصور موجود تھا، اور وہ تصور یہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے آئینی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے، اس طرح کی باتیں مختلف مواقع پر سامنے آتی رہی ہیں۔ خاص طور پر میڈیا ڈیبیٹ میں اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ملک آئین سے چلے گا یا شریعہ سے؟، ملک میں آئین پہلے ہے یا قرآن؟ اس طرح کے سوالات بظاہر عام نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب ایک ہی بات مختلف مواقع پر بار بار دہرائی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ ایک خاص تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کا مقصد اس ملک کے موجودہ نظام کو بدل کر شریعت نافذ کرنا ہے۔ حالاں کہ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ شریعت کا تحفظ اور پورے ملک میں شریعت کو ریاستی قانون کے طور پر نافذ کرنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔

یہاں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ موجودہ دور میں کسی واقعہ سے زیادہ اہم اس کا بیانیہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز سے پیش کیا جاسکتا ہے اور ہر انداز عوام کے ذہن میں ایک الگ تاثر پیدا کرتا ہے۔ جب کسی خاص تعبیر کو مسلسل ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور عوامی گفتگو میں دہرایا جاتا ہے تو وہ محض ایک خبر یا ایک رائے نہیں رہتی، بلکہ رفتہ رفتہ بیانیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر لوگ نئے واقعات کو بھی اسی بیانیہ (Narrative) کی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔

اسی لیے آج کے دور میں بیانیہ سازی کو محض صحافت یا سیاست کا مسئلہ سمجھنا کافی نہیں ہے۔ یہ رائے عامہ کی تشکیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ کسی قوم، طبقے یا جماعت کے بارے میں ایک خاص تصور اگر مسلسل لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ آہستہ آہستہ عام ذہن کا حصہ بن سکتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے بارے میں بننے والے بیانیوں کو محض وقتی واقعات سمجھ کر نظر انداز کرنا درست نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف مختلف موضوعات پر ایسے بیانیے سامنے آتے رہے ہیں جن میں کبھی مسلمانوں کو آبادی کے مسئلے سے، کبھی دہشت گردی اور انتہا پسندی سے، کبھی تبدیلیٔ مذہب سے، کبھی مدارس سے، کبھی حجاب سے اور کبھی ''لو جہاد'' اور ''لینڈ جہاد'' جیسے تصورات سے جوڑ کر ایک خاص تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر موضوع کی نوعیت الگ ہے اور ہر دعوے کا جائزہ بھی الگ طریقے سے لیا جانا چاہیے۔

ملت کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اکثر ردعمل واقعہ کے رونما ہونے کے بعد سامنے آتا ہے۔ کوئی واقعہ پیش آیا، کسی سیاسی لیڈر نے مسلمانوں کے خلاف کوئی بیان دیا، کسی چینل پر مسلم ایشوز پر کوئی بحث ہوئی یا سوشل میڈیا پر کوئی مہم چلی تو اس کے جواب میں عموماً مسلم رہنماؤں کی طرف اجلاس، پریس کانفرنس، احتجاج یا کسی نئے ادارے کے قیام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس پورے عمل میں یہ سوال کم ہی زیر بحث آتا ہے کہ اصل بیانیہ کیا ہے؟ اس کے بنیادی نکات کیا ہیں؟ وہ کس طرح تشکیل پا رہا ہے؟ کن ذرائع سے عام ہو رہا ہے؟ اور اس کے مقابلے میں ہمیں کیا کہنا چاہیے؟

مسلمانوں کے خلاف بننے والے بیانیوں کا باقاعدہ اور مسلسل مطالعہ کیا جانا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس کام کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم ہونی چاہیے جو سماجیات، سیاسیات، ذرائع ابلاغ اور اسلامی فکر میں مہارت رکھتے ہوں۔ وہ ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا میں ہونے والی گفتگو پر نظر رکھے، نئے بیانیوں کی نشان دہی کرے، ان کے بنیادی نکات کو الگ کرے، ان کے پھیلاؤ کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ ایک خاص تصور کس طرح عام ذہن کا حصہ بن رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر خبر یا ہر تنقید کو مسلمانوں کے خلاف سازش قرار دے دیا جائے۔ علمی رویہ یہ ہوگا کہ ہر معاملے کو شواہد کی بنیاد پر دیکھا جائے۔ جہاں اعتراض درست ہو وہاں اس کی اصلاح کی جائے، جہاں غلط فہمی ہو وہاں وضاحت کی جائے، اور جہاں کسی واقعے یا مسئلے کو ایک خاص زاویے سے مسلسل پیش کر کے ایک عمومی تصور قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ان کی نشان دہی کی جائے۔ اسی علمی تجزیے کی بنیاد پر ایک مؤثر جوابی بیانیہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اگر مذکورہ ''شریعت نافذ کرنے'' والے بیانیے کی بات کریں تو اس کے جواب میں صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ مسلمان ایسا نہیں چاہتے، یہ جواب بھی

بہت ناقص اور مبہم سا ہے کہ ملک کا آئین مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ہے کہ مذہب انسانی زندگی میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا اس ملک میں کسی مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ شریعت کا مفہوم کیا ہے؟ شریعت کا تعلق فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے کس طرح ہے؟ شریعت کے دائرہ کار اور ملکی قوانین کے دائرہ کار میں کیا فرق ہے؟ مسلم پرسنل لا کا مطالبہ کس نوعیت کا مطالبہ ہے؟ اور ایک کثیر مذہبی ملک میں مذہبی آزادی اور آئینی نظام کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اس طرح کی گفتگو محض دفاعی انداز میں ’’ہم ایسا نہیں چاہتے‘‘ کہنے تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ ایک مثبت اور فکری رخ اختیار کرے گی۔ اس طرح ایک ایسے سوال کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کے بارے میں ایک خاص تاثر پیدا کرنے کے لیے بار بار اٹھایا جاتا ہے۔

لیکن کیا صرف جوابی بیانیہ تیار کر لینا کافی ہے یا اس کو عوام تک پہنچانا بھی ضروری ہے؟ ایک پریس کانفرنس، ایک مضمون یا ایک پریس ریلیز سے عوامی رجحان تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک واضح اور مدلل بات کو مختلف مواقع پر، مختلف ذرائع کے ذریعہ اور مختلف اہلِ علم کی زبان میں مسلسل پیش کیا جائے۔ جب کوئی بات دلیل کے ساتھ بار بار سامنے آتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ عوامی گفتگو کا حصہ بننے لگتی ہے۔

اس کام میں صرف مذہبی اداروں اور علماء کی شرکت کافی نہیں ہوگی۔ صحافی، دانش ور، اساتذہ، سماجی علوم کے ماہرین اور ایسے برادرانِ وطن جو مسائل کو غیر جانب دارانہ انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں بھی اس گفتگو میں شامل کرنا چاہیے۔ اگر ایک بات مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلمانوں کے درمیان کہی جائے تو اس کا دائرہ محدود رہ سکتا ہے، لیکن جب وہی بات مختلف علمی اور سماجی حلقوں میں دلیل کے ساتھ زیر بحث آئے تو اس کے اثرات وسیع ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں میڈیا سے تعلق بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کسی بھی بیانیہ کو بڑے پیمانے پر عوامی رجحان بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلم ادارے صرف کسی واقعہ کے رونما ہونے کے وقت میڈیا سے رابطہ نہ کریں، بلکہ صحافیوں اور میڈیا اداروں کے ساتھ مستقل علمی اور پیشہ ورانہ تعلق قائم کریں۔ انہیں مسلمانوں کے مسائل، مذہبی تصورات اور سماجی حقیقتوں کے بارے میں مستند معلومات فراہم کریں، ایسے ماہرین ان سے گفتگو کریں جو پیچیدہ مسائل کو سادہ اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

یہ کام کسی ایک فرد یا کسی ایک ادارے کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مستقل علمی و تحقیقی نظام کی ضرورت ہے جو بدلتے ہوئے بیانیوں پر نظر رکھے، ان کا تجزیہ کرے، متعلقہ اداروں کو بروقت آگاہ کرے اور ضرورت کے مطابق جوابی بیانیہ اور ابلاغی حکمتِ عملی تجویز کرے۔ اگر ایسا کوئی نظام موجود ہو تو ہر نئے واقعے کے بعد از سرِ نو سوچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، بلکہ پہلے سے موجود علمی و ابلاغی مواد کافی ہوگا۔

اس پورے معاملے میں ایک بنیادی مسئلہ اور ایک بڑی رکاوٹ ہماری اجتماعی بے ربطی یا ملی انتشار ہے۔ مختلف مسلم ادارے اپنے اپنے دائرے میں کام کر رہے ہیں، اور اچھا کام کر رہے ہیں، مگر ان کے درمیان اہم قومی اور سماجی مسائل پر بھی فکری ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ملکی مسائل کے فہم وادراک میں خاصا فرق پایا جاتا ہے، اسی کے ساتھ دونوں کے درمیان فاصلے بھی بہت ہیں، اسی طرح مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلافات کی بڑی خلیجیں حائل ہیں۔ مختلف افراد کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف اپنی جگہ، مگر بنیادی مسائل اجتماعی موقف ضروری ہے۔

بیانیہ کے میدان میں بھی ہمیں اسی بنیادی اتفاق کی ضرورت ہے۔ ہر ادارہ اپنے طور پر الگ بات کرے گا، مختلف ترجیحات کے ساتھ الگ پیغام دے گا اور ایک دوسرے سے بے خبر رہے گا تو اجتماعی اثر پیدا کرنا مشکل ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر مختلف ادارے، مکاتبِ فکر اور اہلِ علم کم از کم بنیادی قومی و ملی مسائل پر ایک مشترک فکری زاویہ اور مشترک ابلاغی ترجیحات طے کر لیں تو ان کی آواز زیادہ واضح اور مؤثر ہو سکتی ہے۔

موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ مسلمانوں کا ردِعمل محض ’’واقعہ کے بعد ردِعمل‘‘ نہ رہے، بلکہ ’’واقعہ سے پہلے تیاری‘‘ کی شکل اختیار کرے۔ بیانیہ بن جانے کے بعد اس کا جواب دینے کے بجائے یہ بھی دیکھا جائے کہ کون سے موضوعات آنے والے دنوں میں بیانیہ کا مرکز بن سکتے ہیں، ان کے بارے میں پہلے سے علمی مواد تیار کیا جائے، ماہرین کی رائے موجود ہو اور میڈیا یا عوام کے سامنے بات رکھنے کے لیے تربیت یافتہ افراد موجود ہوں۔

جوابی بیانیہ کا مقصد کسی دوسرے طبقے کے خلاف نیا تعصب پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ جو غلط فہمی، یک طرفہ تصور یا غیر متوازن تصویر عام ہو رہی ہے، اس کے مقابلے میں حقیقت، دلیل اور متوازن تصور پیش کیا جائے۔ کسی بیانیہ کو محض رد کرنے کے

بجائے اس کے مقابلے میں ایک بہتر اور قابلِ قبول فکری بیانیہ تشکیل دینا زیادہ مؤثر ہوسکتا ہے۔ عوامی رجحان بھی اسی طرح بتدریج تشکیل پاتا ہے۔ پہلے ایک تصور محدود حلقے میں زیرِ بحث آتا ہے، پھر اسے مختلف ذرائع سے بار بار پیش کیا جاتا ہے، پھر وہ عام گفتگو کا حصہ بنتا ہے اور بالآخر لوگ نئے واقعات کو بھی اسی تصور کی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اگر یہی عمل ایک مثبت، مدلل اور متوازن جوابی بیانیہ کے ساتھ مسلسل اختیار کیا جائے تو وہ بھی رفتہ رفتہ عوامی گفتگو کا حصہ بن سکتا ہے۔ اس کے لیے وقت، تسلسل، درست معلومات اور ادارہ جاتی ہم آہنگی ضروری ہے۔

آج مسلمانوں کے سامنے صرف یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے کہ کسی ایک خبر یا کسی ایک بیان کا جواب کیسے دیا جائے، بلکہ اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے بارے میں بننے والے بیانیوں کو دیکھنے، ان کا تجزیہ کرنے کے لئے موزوں صلاحیت کے حامل افراد موجود ہیں یا نہیں؟ فکری مواد کی تیاری اور اس مواد کو عوام تک پہونچانے کا کیا نظام موجود ہے؟ جب تک اس سوال کا جواب نہیں ملتا، ہمارا ردِعمل زیادہ تر واقعات کے تابع رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ماہرین کی نگرانی میں بیانیوں کی مسلسل مانیٹرنگ، علمی تجزیہ، بروقت جوابی بیانیہ اور منظم ابلاغ کا نظام قائم ہوجائے، اور مختلف مسلم ادارے کم از کم بنیادی مسائل پر فکری ہم آہنگی پیدا کرلیں، تو ہماری اجتماعی گفتگو محض دفاعی ردِعمل سے آگے بڑھ کر ایک منظم فکری عمل کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ تب ہم صرف دوسروں کے بنائے ہوئے بیانیوں کا جواب دینے والے نہیں رہیں گے، بلکہ اپنے بارے میں پیدا کئے جانے والے تاثرات کے مقابلہ میں ایک متوازن، مدلل، اور مؤثر فکری تصور پیش کرسکیں گے۔

☆☆☆

بقیہ: چین میں اسلام اور مسلمان

(۲) ایغور ترک مسلمان، جن کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ان کی آبادی اکثر و بیشتر زنجیانگ یا سنکیانگ صوبے ہی میں مرکوز ہے۔ یہ ایغور دراصل ترکی النسل مسلمان ہیں، جو ہزاروں سال سے ترکستان میں آباد ہیں۔ وہی ان کا اصل مسکن ہے۔ چین کی مانچو حکومت نے ان کے وطن پر قبضہ کرلیا تھا، اس طرح وہ چینی محکومیت اور غلامی میں رہنے پر مجبور ہیں۔

(۳) قازاخ مسلمانوں کا گروپ، جن کی آبادی بھی ۲۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان کی آبادیاں گانزو، سنشی، زنجیانگ وغیرہ صوبوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ قازاخ دراصل وہ تاتاری مسلمان ہیں جو صدیوں سے مشرقی ترکستان میں آباد تھے۔ اب انہیں چین کے مختلف علاقوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ مزید سات نسلی گروپ مسلمانوں کے ہیں، جیسے دونگشیان، کرغیز، سالار، تاجک، ازبک، باوان، تاتاری۔ یہ ساری اقوام مکمل طور پر مسلمان ہیں۔

بہرحال مجموعی طور پر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے چین میں اب بھی ۵ کروڑ مسلمان آباد ہیں، جب کہ سرکاری اعداد و شمار میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۲ کروڑ ۸۲ لاکھ بتائی جارہی ہے، حالانکہ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۴ کروڑ ۸۱ لاکھ بتائی گئی تھی۔ چین جاکر آنے والے حضرات جب چین کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی آبادیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو سرکاری اعداد و شمار ان کی نظر میں مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ چین کے ہر صوبے میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کی آبادی ہے۔ چین کا کوئی صوبہ مسلمانوں کی آبادی سے خالی نہیں ہے۔ ابھی فی الحال تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ مسلمان یونان صوبہ میں ہیں، جو چین کے جنوب مغرب میں میانمار کی سرحد سے متصل ہے، اور فی صد کے لحاظ سے سب سے زیادہ مسلمان زنجیانگ صوبہ میں ہیں، جو چین کے شمال مغرب میں قزاقستان اور کرغیزستان سے ملا ہوا ہے۔

چین میں ۱۹۴۹ء سے کمیونزم نافذ ہے، یعنی صرف ایک پارٹی، چینی کمیونسٹ پارٹی، کی یہاں حکومت ہے۔ کسی دوسری پارٹی یا جماعت کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس طرح جمہوری عوامی الیکشن کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔ حکومت کے خلاف بیان دینے کی بھی اجازت نہیں ہے، اور حکومت کے خلاف احتجاج پر موت کی سزا ہوسکتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے بعد روس اور دیگر مشرقی یورپ کے ملکوں سے تو کمیونزم کا خاتمہ ہوگیا، لیکن چین میں اب تک کمیونزم برقرار ہے، البتہ معاشی اور مذہبی اعتبار سے کچھ نرمی کا مظاہرہ کیا جانے لگا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد چین کی کمیونسٹ حکومت نے مذہب کے سلسلے میں تھوڑی بہت چھوٹ دیتے ہوئے مسلمانوں کو نماز پڑھنے، اذان دینے اور حج کرنے کی اجازت دی۔ اس کے باوجود کئی پابندیاں ابھی بھی لگی ہوئی ہیں، جیسے اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کو مسجد جانے کی اجازت نہیں ہے، عورتوں کو برقعہ پہن کر باہر نکلنے اور دو سے زیادہ بچوں کو پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ دینی شعائر کی توہین کرنے اور دینداروں کا مذاق اڑانے کا سلسلہ حکومتی پیمانے پر جاری ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کی حرکتیں صرف مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کی جاتی ہیں، جو چین سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتے ہیں، جبکہ چین کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

ذکرِ رفتگاں

ایک عہدِ علم وادب کا اختتام

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

ہزاروں تشنگانِ علوم نبوت کے محبوب ومقبول استاذ گرامی، عربی زبان وادب اور عربی صحافت و خطابت کے نامور فرد فرید، بحرِ زبان وقلم کے درشاہوار اور ندوۃ العلماء کے قابل صد فخر فرزند حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندویؒ کا طویل علالت کے بعد بدھ، ۷/اکتوبر ۲۰۲۶ء کو احاطۂ ندوۃ العلماء سے متصل مکارم نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تقریباً ۹۳/سال کی عمر میں تین بجے انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے انتقال کی خبر علمی ودینی حلقوں میں غم واندوہ کی لہر بن کر پھیل گئی، سیکڑوں دلوں کو غمناک اور ہزاروں آنکھوں کو نمناک کرگئی۔ انتقال کی خبر ملتے ہی ندوہ کے موقر ذمہ داران، اساتذہ وطلبہ اور اہل تعلق آخری دیدار کے لئے مولانا مرحوم کے گھر جوق در جوق جانے لگے، ایک سلسلہ جو شروع ہوا، وہ رات بھر اور پھر نماز جنازہ تک جاری رہا۔

استاذ گرامی قدر کی وفات محض ایک عالم وفاضل علوم اسلامی، مدرس وصحافی اور منتظم ومربی کی رحلت نہیں؛ بلکہ ایک ایسی مثالی شخصیت کی جدائی ہے جس نے اپنی زندگی کے ۷۵/برسوں سے زائد تعلیم و تدریس، عربی زبان و ادب، تصنیف و تالیف، صحافت و دعوت، امامت وخطابت اور افراد سازی کے لیے وقف کردیئے تھے، ان کے انتقال سے ہم شاگردوں نے ایک ایسے مربی کو کھودیا جس کی زندگی ندوۃ العلماء اور اس کے نامور فرزندوں کی علمی ودینی تاریخ کے ساتھ مربوط ومنسلک تھی۔

نماز جنازہ کے لئے اگلے روز جمعرات ۸/اکتوبر آٹھ بجے صبح کا اعلان ہوا، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں نمازِ جنازہ مخدوم گرامی قدر ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی اقتداء میں ادا کی گئی، نمازِ جنازہ میں ندوہ کے اساتذہ، طلبہ، جدید وقدیم فارغین، ملک کے مختلف علاقوں، معروف تعلیمی اداروں، ملی تحریکوں، قومی تنظیموں، سماجی اداروں کے نمائندے، اہل علم وفضل اور عوام وخواص کی بڑی تعداد شریک ہوئی، جنازہ میں شہر لکھنؤ اور اطراف کے علاوہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع بشمول دیوبند، دہلی، پٹنہ، مونگیر، بھوپال اور دیگر ریاستوں اور مختلف خطوں سے بھی اہل تعلق پہنچے۔

نماز کے بعد جنازہ ڈالی گنج قبرستان لے جایا گیا، لوگوں کی بڑی تعداد یہاں پہنچی، جہاں انہیں سپردِ خاک کیا گیا، جم غفیر کی وجہ سے ڈالی گنج قبرستان تک آمد ورفت کو منظم رکھنے کے لیے متعدد رضا کاران متعین تھے، نظم ونسق میں مزید بہتری کے لئے پولیس اہلکار بھی تعینات کیے گئے۔

تجہیز وتکفین اور تدفین کے یہ مناظر ایک مسلمان کو آخری منزل کی یاددہانی بھی کررہے تھے کہ علم وفضل، مقام ومنصب اور عمر بھر کے مشاغل سب دنیا میں رہ جاتے ہیں؛ انسان اپنے اعمال کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہوتا ہے؛ البتہ اس کے چھوڑے ہوئے علم نافع، اعمال صالحہ اور نیک اولاد اس کی یادوں کو زندہ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندویؒ ۱۴/مئی ۱۹۳۴ء کو اتر پردیش کے مئو میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی اور دینی تعلیم جامعہ مفتاح العلوم مئو میں ہوئی، ۱۹۵۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے۔ پھر زندگی کا وہ علمی سفر آگے بڑھا جو تدریس، عربی صحافت اور انتظامی ذمہ داریوں تک بخوبی پہنچا، تعلیمی مرحلہ کی تکمیل کے بعد انہوں نے تدریسی خدمات کا آغاز ندوہ ہی میں کیا اور بتدریج ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہونے لگا، ان کی علمی دلچسپی کا سب سے نمایاں میدان عربی زبان و ادب اور اسلامی صحافت تھا، انہوں نے عربی ادب، تنقید، تحقیق اور تحریر وخطابت کے ذریعہ اپنی شناخت قائم کی اور ان تمام شعبوں میں انمٹ نقوش چھوڑے۔

مولانا مرحوم کی خدمات کا ایک اہم باب عربی صحافت ہے، وہ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے معروف عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" سے طویل عرصہ تک وابستہ رہے، پہلے اس کے بانی حضرت مولانا سید محمد الحسنیؒ کے معاون اور پھر اس کے رئیس التحریر کی حیثیت سے نمایاں کردار ادا کیا، اس رسالہ کے ذریعہ ہندوستانی علمی و دینی حلقوں کے افکار، علمی ودینی اور ملی وسماجی سرگرمیوں کو عرب دنیا تک پہنچانے میں قابل قدر خدمت انجام دی۔

فرزندانِ ندوہ کی ادبی وصحافتی خدمات کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عربی زبان کو ہندوستان کے علمی ماحول اور عالم اسلام کے درمیان رابطہ کا وسیلہ بنایا، اس طرح مولانا کی خدمات کا دائرہ صرف تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں تک محدود نہیں رہا؛ بلکہ عربی زبان و ادب سے وابستہ وسیع تر حلقوں تک پھیلا، اور سیکڑوں افراد کو عربی زبان کا شیدائی بنادیا۔

دار العلوم میں کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا کے ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۹ء تک عمید رہے، ۲۰۰۰ء میں انہیں اہتمام کی ذمہ داری سونپی گئی، اس طرح تعلیم وتدریس کے ساتھ انتظامی اور تعلیمی امور میں بھی طویل خدمات انجام دیں، ان کی شخصیت میں عالم، استاذ، ادیب، مصنف، مترجم، صحافی، خطیب اور منتظم کے متعدد ومتنوع پہلو ایک ساتھ جمع تھے، یہی جامعیت انہیں ان لوگوں کی نگاہ میں ممتاز بناتی تھی جنھوں نے ان کے ساتھ کچھ وقت کام کیا یا ان سے کبھی استفادہ کیا۔

مولاناؒ کے فیض یافتگان مختلف علاقوں اور علمی حلقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کی تدریسی اور ادبی خدمات کا اثر ان کے براہِ راست شاگردوں کے علاوہ ان کے مضامین، علمی تحریروں اور عربی صحافت کے ذریعے بھی دور دور تک پہنچا، اس اعتبار سے ان کی علمی وفکری میراث ان کے ذاتی تعلقات سے کہیں زیادہ وسیع وطویل ہے۔

مولانا کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہیں: درس وتدریس میں طویل وابستگی، عربی زبان وادب میں تخصص، تصنیف وترجمہ سے شغف، عربی صحافت وخطابت کے ذریعہ علمی وعوامی رابطوں کا فروغ اور عالم اسلام کی ایک عظیم دینی تعلیمی دانش گاہ کی ذمہ داریوں کی انجام دہی۔

مولانا کے دروس وخطابات سے مستفید ہونے والے شاگردان ومحبین، ان کی تحریروں کے قارئین، عربی صحافت وخطابت کے میدان میں ان کی خدمات اور یادوں کو زندہ رکھیں گے، ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت عطا کرے، ان کی علمی ودینی خدمات کو قبول فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، ندوۃ العلماء کو ان کا نعم البدل اور ان کے اہلِ خانہ، متعلقین اور شاگردوں کو صبر جمیل دے، آمین۔

☆☆☆

اعلان خصوصی اشاعت بیاد

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

قارئینِ کرام!

”تعمیرِ حیات“ کا ایک خصوصی شمارہ ندوۃ العلماء کے قابل فخر فرزند اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات کے تذکرے اور ان کی علمی و دینی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مختص کیا جا رہا ہے۔

اہلِ قلم سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی تازہ نگارشات درج ذیل موضوعات کی روشنی میں مرتب کر کے سالِ رواں کے ماہِ نومبر کے اختتام تک دفتر ”تعمیرِ حیات“ کو ارسال فرمائیں۔

موضوعاتِ نگارش

- شخصی وخاندانی کوائف
- تعلیم وتربیت
- سیرت واخلاق
- تدریسی وانتظامی خدمات
- مناصب وعہدے
- علمی وادبی خدمات
- صحافت وخطابت
- تصنیفات وتالیفات
- واقعات، مشاہدات وتاثرات

نوٹ: اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ مضامین ٹائپ شدہ، نظرِ ثانی شدہ اور اغلاط سے پاک ہوں، تاکہ اشاعت کے مراحل میں سہولت رہے۔ اس تعاون کے لیے دفتر ”تعمیرِ حیات“ آپ کا شکر گزار ہوگا۔

ای میل: tameerehayat2026@gmail.com

برائے رابطہ: 9918818558 - 6202719928 - 9621540462

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

حیاۃ الصحابۃ

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاذ عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی حفظہ اللہ علم وفضل اور زبان وادب دونوں ہی پہلوؤں سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھیں تقریر وخطابت، مضمون، نگاری وانشاء پردازی، درس وتدریس، اور بحث وتحقیق ہر ایک میدان میں ید طولی حاصل ہے۔

کچھ عرصہ قبل مولانا مدظلہ کے قلمِ گوہر بار سے ایک خوبصورت کتاب اردو زبان میں "صحابۂ کرام کی زندگی کے روح پرور واقعات" کے نام سے معنون منظرِ عام پر آئی تھی، اور کافی مقبول ہوئی۔ اب اسی کتاب کا عربی نسخہ "قبسات من حیاۃ الصحابۃ" کا عنوان لیے حسنِ طباعت کی مثال ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

مولانا مدظلہ کی یہ کتاب عصرِ حاضر میں ناصبیت و شیعیت کے درمیان الجھی ہوئی افراد امت کی ایک جماعت کی باہمی رسہ کشی کے زور سے پیدا ہونے والی ایک عجیب وغریب صورتحال کا سامنا کرنے والی تحریروں میں شامل کی جاسکتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مد ظلہ اس کتاب اور اس میں درج کردہ واقعات کے ضمن میں 'صحابہ کے حوالہ سے افرادِ امت میں وہ احساس وشعور پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے ان کی عظمت وقداست دل ودماغ میں راسخ ہو، اور ان کے اتباع کی توفیق ہو۔ اسی لیے انھوں نے محض واقعہ بیانی پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد اس سے مستفاد نکات اور فوائد بھی بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب 'حیاۃ الصحابۃ' کے عنوان پر لکھے جانے والی منفرد اسلوب کی کتاب کہی جاسکتی ہے۔

مولانا مدظلہ نے اس کتاب میں کل چالیس سے زیادہ واقعات کا انتخاب کیا ہے، اور اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام واقعات میں ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے، گویا ان واقعات کو منتخب کیا گیا ہے جو صحابۂ کرام اور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے مابین پیش آئے، یوں ان کے حسن وجمال کو کمال استناد حاصل ہوگیا ہے۔ اور دوسری خصوصیت یہ کہ یہ ایسے واقعات ہیں جو غضب کی تاثیر رکھتے ہیں: ان سے اولوالعزمی پیدا ہوتی ہے، ایمان میں تازگی آتی ہے، نفسانیت سرد پڑتی ہے، اور قربانی وسرفروشی کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

اس کتاب کے اردو قالب کو عربی قالب عطا کرنے والے ہمارے رفیقِ کار اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ہونہار جواں سال استاذ جناب عبد الرشید راجستھانی ندوی ہیں، جن کی اردو عربی ترجمہ کی مہارت کے کئی نمونے پہلے بھی ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ انھوں نے مولانا کی زبان کی چاشنی کو عربی میں منتقل کرکے اپنی اس مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ زادہ اللہ فضلا وتوفیقا

'جمعیۃ المعارف الاسلامیۃ' ٹیگور مارگ، ڈالی گنج لکھنؤ سے شائع ہوکر ندوۃ العلماء کے نواحی کتب خانوں پر دستیاب ہیں۔ خریدنے کے لیے مندرجۂ ذیل نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰

تعلیم الحدیث

مولانا بلال عبد الحی حسنی ندوی

پیش کش: سیف اللہ ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی تقریبا چار صدیوں سے اہلِ اسلام کی دینی، فکری، علمی اور روحانی تربیت کی آماجگاہ ہے۔ حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے وہاں جس سلسلہ کی بنیاد پڑی وہ بفضلہ تعالی آج بھی جاری وساری ہے، اور اللہ تعالی آگے بھی اس کو باقی رکھے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

خاص طور پر رمضان میں امت کے افراد دور دراز کا سفر طے کرکے وہاں قیام کرتے ہیں اور وہاں تعلیمی و تربیتی نظام سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی نظام کے تحت درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی 'قرآنی افادات' تکیہ کی مسجد میں ماہِ مبارک میں دیے گئے دروسِ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ حضرت مفکرِ اسلام کے بعد مرشدِ امت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور ان کے ساتھ فقیدِ دعوتِ اسلام مولانا عبد اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس سلسلہ میں شریک رہے، اور اب مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے دروس کا سلسلہ جاری ہے۔

انھی دروس کو جناب سیف اللہ ندوی صاحب استاذ مدرسۃ الفلاح، اندور نے رکارڈ کرکے مرتب شکل میں ایک رسالہ تیار کردیا ہے، جس میں کل ۱۱ دروس ہیں۔ ان دروس کا موضوع درود کی اہمیت و فضیلت اور فوائد، عقائد کی درستی، اہلِ بیت کی محبت، مشاجراتِ صحابہ کی حقیقت، ایذا رسانی سے پرہیز، روزی ومعاش کی کوشش وغیرہ ہے۔ یہ دروس بالکل عام فہم، سلیس اور آسان زبان میں ہیں، چشم کشا و بصیرت افروز ہیں، اور سب کے لیے مفید۔

'مدرسۃ الفلاح، اندور' نے شائع کیا ہے، اور رائے بریلی ولکھنؤ کے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ حصول کے لیے رابطہ کریں: ۹۹۱۸۸۱۸۵۵۸

☆☆☆

ذکرِ رفتگاں

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت کے چند نمایاں نقوش

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اکثر لوگ دنیا میں آتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور پھر خاموشی سے رخصت ہو جاتے ہیں؛ ان کے آنے اور جانے سے کوئی غیر معمولی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی زندگی محض ان کی اپنی زندگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے عہد کی علمی روایت، فکری میراث اور تہذیبی شناخت کا ایک روشن باب بن جاتی ہیں۔ ان کا رخصت ہونا صرف ایک فرد کا دنیا سے اٹھ جانا نہیں ہوتا، بلکہ ایک پورا علمی ماحول ان کی جدائی سے سوگوار ہو جاتا ہے اور ایک عہد اپنے ایک معتبر ترجمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندویؒ بھی ایسی ہی شخصیات میں سے ایک تھے۔

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندویؒ کی شخصیت میں بہت سی متنوع خوبیاں جمع تھیں۔ وہ ایک ایسا آئینہ تھے جس میں ہر شخص اپنے ذوق و مزاج اور فکری رجحان کے مطابق ان کی شخصیت کے مختلف پہلو دیکھ سکتا تھا۔ ان کے اوصاف کی ترجیحات میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن چند خوبیاں ایسی تھیں جن کی نمایاں حیثیت اور امتیازی اہمیت سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو؛ مثلاً وقت کی قدر و پاسداری، قرآن کریم سے والہانہ تعلق، عربی زبان سے عشق، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے گہری عقیدت، اور ندوۃ العلماء سے بے لوث وابستگی اور مخلصانہ خدمت۔ یہ اوصاف محض ان کی شخصیت کے مختلف گوشے نہیں تھے، بلکہ ان کے علمی و فکری مزاج اور طرزِ حیات کے بنیادی عناصر تھے، جنہوں نے ان کی شخصیت کو ایک منفرد شناخت عطا کی اور انہیں اپنے عہد کی ایک ممتاز اور یادگار شخصیت بنا دیا۔

بلاشبہ کسی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ چند صفحات میں ممکن نہیں، اور نہ ہی چند اوصاف کا تذکرہ اس کے پورے علمی و عملی وجود کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ تاہم بعض نمایاں نقوش ایسے ہوتے ہیں جن کے ذریعے کسی شخصیت کے مزاج، ترجیحات اور زندگی کے بنیادی محرکات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

وقت کی پاسداری

مولانا مرحوم کی شخصیت کے نمایاں اوصاف میں وقت کی پابندی اور نظم و ضبط کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہ وقت کو محض گھڑی کی سوئیوں کی گردش نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک قیمتی امانت تصور کرتے تھے، جس کا ایک ایک لمحہ کسی بامقصد کام میں صرف ہونا چاہیے۔ ان کی وقت شناسی کا یہ عالم تھا کہ یہ بات مشہور تھی کہ گھڑی میں وقت غلط ہو سکتا ہے، لیکن مولانا کے وقت میں فرق نہیں ہو سکتا۔

تصنیف و تالیف، صحافتی ذمہ داریاں، علمی مصروفیات اور دارالعلوم کی خدمت و سرپرستی؛ ان کے مشاغل کی فہرست خاصی طویل تھی، لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود ان کے معمولات میں جو ترتیب، پابندی اور نظم و ضبط دکھائی دیتا تھا، وہ ان کی شخصیت کا ایک امتیازی وصف تھا۔

قرآن کریم سے والہانہ تعلق

حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کا سب سے روشن اور تابناک پہلو قرآن کریم سے ان کا گہرا، مسلسل اور وجدانی تعلق تھا۔ قرآن ان کے لیے محض تلاوت کی کتاب نہیں، بلکہ ان کی فکر کا سرچشمہ، ان کے مزاج کی تشکیل کا ذریعہ اور ان کی زندگی کی روح تھا۔ اس سے ان کی وابستگی محض رسمی نہیں، بلکہ ایک ایسی قلبی نسبت تھی جو ان کے شب و روز میں نمایاں تھی۔

تلاوتِ قرآن کا اہتمام اور اس پر مداومت ان کی زندگی کا ایک خاص امتیاز تھا۔ ان کے معمولات کا یہ عالم تھا کہ ہر نماز کے بعد اپنے مصلّٰی پر بیٹھ کر قرآن کریم کا ایک مقررہ حصہ تلاوت کرتے اور اس کی تکمیل کے بعد ہی وہاں سے اٹھتے۔ یہ محض ایک معمول نہیں، بلکہ قرآن سے ان کی والہانہ محبت، غیر معمولی شغف اور پختہ وابستگی کا مظہر تھا۔

مولانا کی گفتگو میں جو دینی سنجیدگی، فکر میں جو گہرائی اور رویے میں جو ٹھہراؤ محسوس ہوتا تھا، اس کے پس منظر میں قرآن کریم سے ان کی یہی دیرینہ وابستگی کارفرما تھی۔ وہ قرآن کو صرف پڑھنے کی نہیں، سمجھنے، اس میں غور و تدبر کرنے اور اسے زندگی میں اتارنے کی کتاب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شخصیت میں قرآن کا اثر محض زبان تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کے فکر و نظر، مزاج و کردار اور طرزِ زندگی میں بھی نمایاں تھا۔ بلاشبہ قرآن سے ان کا تعلق ان کی شخصیت کا وہ روشن باب تھا جس سے ان کے دیگر اوصاف کو بھی روشنی ملتی تھی۔

عربی زبان سے عشق

عربی زبان و ادب پر مولانا مرحوم کی غیر معمولی دسترس ان کی علمی شناخت کا ایک اہم

امتیاز تھی۔ عربی ان کے لیے محض ذریعۂ اظہار نہیں، بلکہ ان کی علمی و تہذیبی روح تھی۔ عربی کے مصادر، اسلامی لٹریچر اور قدیم علمی ذخیرے سے ان کی گہری واقفیت نے ان کے مطالعہ کو وسعت، فکر کو گہرائی اور قلم کو پختگی عطا کی تھی۔

جن حضرات کو مولانا سے عربی ادب پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ عربی زبان کے تئیں ان کی حساسیت، اس کے اسالیب و محاسن سے ان کی گہری واقفیت اور اس کے ادبی ذوق و مزاج کی نزاکتوں سے ان کی غیر معمولی آگہی کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ عربی پڑھاتے وقت محض الفاظ و تراکیب کی تشریح پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ زبان کی روح، اسلوب کی لطافت اور ادب کی معنوی گہرائیوں تک رسائی کی راہ دکھاتے تھے۔ ان کے نزدیک عربی ادب کا مطالعہ محض ایک علمی مشغلہ نہیں، بلکہ ایک وسیع تہذیبی اور فکری دنیا سے آشنائی کا ذریعہ تھا۔

حضرت مفکر اسلام سے عقیدت

مولانا مرحوم کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کی محبت و عقیدت اور گہری نسبت کو سمجھنا ضروری ہے۔ مولانا مرحوم کے دل میں حضرت مولاناؒ کے لیے بے پناہ محبت، عقیدت اور وارفتگی تھی۔ یہ تعلق محض عقیدت و احترام کا تعلق نہیں تھا، بلکہ اس کے پس منظر میں ایک گہری فکری و روحانی نسبت کارفرما تھی، جس نے مولانا مرحوم کی شخصیت، فکر اور طرز زندگی پر گہرے نقوش ثبت کیے تھے۔

حضرت مفکر اسلامؒ ان کے لیے صرف ایک محبوب استاذ، جید عالم دین، معروف صاحب قلم یا سرپرست نہیں تھے، بلکہ ان کے فکری و روحانی رہنما تھے۔ حضرت مولاناؒ کے اندر جو امت کا درد تھا، دعوت و اصلاح کا جو جذبہ تھا، اسلام کی سربلندی اور انسانیت کی ہدایت کے لیے جو تڑپ تھی، مولانا مرحوم نے اسے محض حضرت مولانا کی کتابوں میں نہیں پڑھا، بلکہ قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور اپنی زندگی میں اسے برتنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عقیدت میں محبت کی وارفتگی کے ساتھ فکر کی پیروی کا شعور بھی تھا۔

یہ عقیدت اور یہ نسبت محض حضرت مفکر اسلامؒ کی حیات تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی مولانا مرحوم نے اس فکری و دعوتی رشتہ کو پوری استقامت اور اخلاص کے ساتھ باقی رکھا انھوں نے کسی مرحلہ پر حضرت مولاناؒ کی فکر و دعوت سے صرف نظر نہیں کیا، بلکہ ان کے علمی و فکری ورثے سے اپنی وابستگی برقرار رکھی۔

حضرت مفکر اسلامؒ کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور پھر حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی سے بھی ان کا قلبی و فکری تعلق اسی اخلاص اور وفاداری کے ساتھ قائم رہا۔ یہ محض شخصی تعلقات کا تسلسل نہیں تھا، بلکہ اس فکری روایت سے وابستگی کا اظہار تھا جسے حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کا مشن بنایا تھا۔

ندوۃ العلماء سے قلبی وفاداری

ندوۃ العلماء سے مولانا مرحوم کا تعلق ان کی زندگی کا شاید سب سے گہرا اور جذباتی باب تھا۔ ان کے نزدیک ندوہ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک فکر، ایک روایت، ایک علمی مزاج اور ایک عظیم دعوتی ذمہ داری کا نام تھا۔

قدیم و جدید کے درمیان ربط، علوم اسلامیہ سے گہری وابستگی، عربی زبان و ادب کی ترویج اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت، یہ وہ عناصر ہیں جنھوں نے ندوۃ العلماء کو برصغیر کی علمی تاریخ میں ایک منفرد مقام عطا کیا، اور یہی عناصر مولانا مرحوم کی فکری زندگی میں بھی نمایاں تھے۔

دارالعلوم کی خدمت ان کے لیے محض ایک انتظامی فریضہ نہیں، بلکہ دل کا تعلق اور ایک مقدس امانت تھی۔ وہ عمارتوں کی نگہداشت کے ساتھ اس کے علمی و فکری ماحول کے تحفظ کے لیے بھی برابر فکر مند رہتے تھے۔ ندوۃ العلماء کی خدمت ان کے نزدیک محض ایک ذمہ داری نہیں، بلکہ زندگی کا ایک بنیادی مقصد تھی۔ انھوں نے اپنے تعلقات کی بنیاد بھی اسی مقصد کو بنایا؛ بسا اوقات ندوہ کی مصلحت اور اس کی خدمت کی خاطر گہرے ذاتی تعلقات کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ ادارے کے مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے اپنی خودداری اور ذاتی انا کو پس پشت ڈال دیا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت اپنی ذات یا ذاتی تعلقات کی نہیں، بلکہ ندوہ کی علمی روایت، اس کے وقار اور اس کے مستقبل کی تھی۔

جب ایسی شخصیات دنیا سے اٹھتی ہیں تو صرف ایک فرد کم نہیں ہوتا، بلکہ ایک پورا علمی ماحول اپنے ایک معتبر ترجمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، اسے کسی ایک فرد سے پُر کرنا آسان نہیں ہوتا؛ کیونکہ شخصیات اپنی جگہ نہیں چھوڑتیں، وہ ایک روایت چھوڑ جاتی ہیں۔

آج مولانا مرحوم ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی علمی خدمات، ان کی تحریریں، ان کا ادبی ذوق، ان کے معمولات اور ان کی قائم کردہ مثالیں ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ اہل علم کی زندگی کا اصل تسلسل ان کے افکار، ان کے علمی ورثے اور ان قدروں میں ہوتا ہے جنھیں وہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 10th October 2026 | تاریخ ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۶ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا) عبدالعزیز خلیفہ بھٹکلی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا